افسانے
حقل دما
آغا گل

حَقل دَما

افسانے

آغا گل

Aqal Dma

عقل دما

FICTION

افسانے

By
Agaha Gull

@Agaha Gull

Year of Publication:
2021
Edition:
First Edition
Quantity
500
Price:
Rs 400/-

Publisher:
Advance Solutions
and Assessment Network

Supervision:
Muhammad Akram Panialvi

Composing:
Muhammad Asif

www.asanbooks.com
ISBN 978-969-694-121-7

دوقومی نظریہ کی صلیب پر ٹنگے سماج کے نام!

جہاں مجھ جیسے ادیبوں کی کتابیں تھڑوں پہ بکتی ہیں اور جوتے ایئر کنڈیشن دکانوں میں۔ جہاں جینوئن لکھاریوں کا نام ادیبوں کی عسکری اور سول فہرست سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔

فہرست

پیش لفظ 7

کالی پت 9

چاند گرہن 21

شعلہء زباں 32

عوضی 40

بھیچ کاگ 50

معمورہ فرنگی 60

شُوم کا مال 73

گدھے کی واپسی 84

کاماسوترا 91

دَرُوج 100

چارگل 113

حقل دَما 125

پیش لفظ

بادشاہ کا دربار چوں کہ طویل ہوا کرتا تھا، درباری باشاہ کی حرکات وسکنات دیکھ نہ سکتے، لہٰذا Prompter جب smile کا پلے کارڈ دکھاتا تو سارے درباری زن ومرد مسکرانے لگتے، پھر وہ بورڈ دکھاتا laugh تو سبھی ہنسنے لگتے۔

بادشاہ تو برطانیہ لوٹ گیا، اپنا بورڈ اپنے لے پالک کو دیتا گیا، جیسے ہی بورڈ بلند ہوتا ہے؛ ''کشمیر'' ہمارے ادیب شاعر کشمیر کے لیے بلکنے لگتے ہیں، بورڈ بلند ہوتا ہے؛ ''فلسطین'' تو سبھی درباری فلسطین کے لیے تڑپنے لگتے ہیں۔ انھیں 380 ڈھانچوں والی توتک کی اجتماعی قبر، مسخ شدہ لاشیں، اغوا شدہ مظلوموں کے گھروں سے بلند ہوتے نوحے، ہزارہ massacre، پنجابی آباد کاروں کا قتل عام، بلوچوں کا genocide دکھائی نہیں دیتا۔ کالے شیشوں والی کابلی لینڈ کروز کے اوپر پاکستان کا جھنڈا لگا کر فلسطین کی ہمدردی میں جلوس نکالتے ہیں۔ واہ رے مجاہدو، بحر ظلمات میں کابلی گاڑیاں دوڑانے والو، 70 لاکھ سے سیرینا ہوٹل میں جرنیل کو خوش کرنے کے لیے ادبی تقاریب کرنے والو!

بلوچستانی ادیب کبھی حال کی بات نہیں کرتا، بلکہ ماضی کی عظمت کے ترانے گاتا

ہے، حال کی ذلت پہ نہیں لکھتا، بے بسی، بے کسی پہ نہیں بلکہ چاکر رند کی بہادری، نودبندغ کی سخاوت، حانی وسمو کے حسن، شاہ مرید ومست کے عشق پہ لکھتا ہے، نصیر خان نوری کے گھوڑے کی دم سے لٹکا سدا شیورا اور مرہٹہ سے لڑتا ہے، ادیب وشاعر ماضی کی کلاسیکل عظمت کی بھنگ پلا کر نوجوانوں کو مست رکھتا ہے، اپنا ادبی چنڈو خانہ چلا کر کماتا ہے، آقا اس کی جیب گرم رکھتا ہے۔

ڈپلومیسی کی تعریف ہے کہ خدا کی اس طرح عبادت کرو کہ شیطان بھی ناراض نہ ہو، یہ بھی بلوچوں کے خون میں نوالے ڈبو کر کھاتے، جان بناتے ہیں۔ یہ ادیب وشاعر نہیں، بادشاہ کے درباری Prompters ہیں۔

آغا گل

24 مئی 2021

گل ہاؤس، گل باغ

سمنگلی روڈ، کوئٹہ

0303-3850099

aaghagul@gmail.com

کالی پت

ڈاکٹر سلیم سے میری ملاقات اتفاقاً ہی ہوئی۔میری والدہ ہسپتال میں داخل تھیں۔ سلیم زندگی کے آخری ایام ڈاکٹرز میس میں کاٹ رہا تھا۔وہ تھا امیر گھرانے کا'سوچا کہ مرنے سے پہلے کوئی نیکی کا کام کرتا جائے۔اس نے میس جاری کر دیا۔میں نے درخواست کی کہ مجھے میسنگ کی اجازت دی جائے جب کہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔اس نے فوراً ہی نہ صرف اجازت دے دی بلکہ وی آئی پی کا درجہ بھی دیا۔اکثر ڈاکٹر اس کے قرض دار رہتے۔وہ بل کا تقاضا بھی نہ کرتا۔اسے جانے کیا بیماری تھی ،پھول کر کپا ہو گیا تھا۔فلم 'شعلے' والے امجد خان کی مانند پھیلتا ہی جا رہا تھا۔تھا تو گورا چٹا، قد بھی لمبا تھا مگر حالات نے اسے لافنگ بدھا جیسا گول مٹول بنا دیا تھا۔کہتے ہیں عینک کا جو آخری نمبر ہوتا ہے، وہی لگائے رہتا ورنہ تو پاس کھڑی بھینس بھی اسے دکھائی نہ دیتی۔

والدہ جو صحت یاب ہو کر گھر گئی تو میرا میس بل لینے سے انکار کرتے ہوئے سلیم نے بتلایا کہ وہ دوستوں سے بل نہیں لیتا۔اس نے گنیش جی جیسا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے اپنا رویہ واضح کر دیا۔وہ ایک بے ضرر سا انسان دوست نا کام ڈاکٹر تھا۔اس کے کمرے میں بھارتی گیتوں کا انمول خزانہ تھا جیسے وہ رات بھر سنتا رہتا اور سر دھنتا رہتا۔اس کے کمرے میں جانے کا

شرف کسی کسی کو ہی حاصل ہوتا، ورنہ اندر سے ہی ہانک لگاتا کہ نہیں مل سکتا۔ احباب نے ہی خفیہ طور پہ راز افشا کیا تھا کہ زمانہ طالب علمی میں کسی انارکلی سے دھانسو عشق لڑایا تھا جو ناکام رہا۔ جانے کون سا اکبر بادشاہ انارکلی کو لے کے چلتا بنا۔ شیخو کا دل ٹوٹ گیا۔ ترکِ موالات، ترکِ دنیا کر کے ڈاکٹرز میس کے ہی ایک کمرے میں خود ساختہ قید تنہائی اور جلاوطنی اختیار کرلی۔ ماہ بہ ماہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک بھاری رقم بھائی بھجوادیا کرتے۔ بھائیوں سے وہ کسی نہ ملتا۔ کوئی ملنے بھی آتا تو ایسی بے اعتنائی برتتا کہ چند ماہ کے لیے وہ غائب ہی ہو جاتا۔

میں بھی نایاب گیتوں کی چاہ میں اس کے ہاں جایا کرتا۔ وہ نت نئے کھانے بھی میرے لیے بنوایا کرتا۔ دفتر میں دن بھر دل جلانے کے بعد شام میں دو اڑھائی گھنٹے شیخو کے ساتھ گزارنے سے اگلے روز جینے اور ملازمت کا حوصلہ برقرار رہتا۔ جعلی ڈگریوں والے ان پڑھ وزیر، ایجنسیوں کے پروردہ سیاسی لیڈر افسروں کو آنکھیں دکھاتے جبری رخصت پہ گھر بھجوادیتے یا او ایس ڈی لگوادیتے۔ افسروں کے چلتے میٹر بند ہوتے تو وہ بھی تلملانے لگتے۔ ورنہ تنخواہ وصول کرتے ہوئے چھٹی پہ رہنا ایک خوشگوار تجربہ ہے۔

ڈاکٹر سلیم جسے پیٹھ پیچھے دوست شیخو کہا کرتے، کو ایک ہی عشق نے مار ڈالا۔ ورنہ تو لوگ بہت سے عشق کرتے ہیں۔ عشق ہی تو مشغلہ دل ہے۔ ورنہ جس ملک کے حکمران علم سے ڈرتے ہوں، کتابوں سے خوف زدہ ہوں، سپاہی مزار مسمار کرتے ہوں، دکانوں سے کتابیں اٹھالے جاتے ہوں، وہاں زندگی بسر کرنا دشوار ہے۔ اس خوف کے عالم میں بھی بانگو اذان دیتا ہو تو بھلا ئی کوئی مرد کیا کرے۔ جہاں صرف عشق کرنے اور وضو بنانے کی ہی آزادی ہو وہاں شیخو کا اندازِ فکر مجھے تو پسند آیا۔ باوجودیکہ دوستی کے جو روز بروز گہری ہوتی گئی۔ شیخو کسی طور بھی انارکلی کے بارے میں بالکل خاموشی ہی رہتا۔ میں داستانوں اور اساطیری حوالوں سے محبت کے بارے میں کچھ بولتا بھی تو وہ جمعہ خانی کرنے لگتا۔ بالکل انجان بن کر اپنے بنگالی خانساماں کی تعریف کرنے لگتا۔ جو اعلیٰ مچھلی اور لذیذ کباب بنایا کرتا۔

شیخو نے ایک روز مجھے بتلایا کہ اب اس کا چل چلاؤ قریب ہے۔اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہے، ایڈیما بھی ہے۔وہ لیٹ کر نہیں سو سکتا ورنہ پھیپھڑوں میں پانی بھرنے لگتا ہے۔ ساری ساری رات وہ ٹیک لگائے گزار دیتا ہے۔ پاس کے کمرے میں ہی ہمارا دوست ڈاکٹر اشوک رہتا تھا، جو سرِ شام پینے پلانے لگتا ہے۔اس کے کمرے سے قہقہے بلند ہوتے رہتے۔ اس کے دوست پی پلا کر جھومتے جھامتے لڑھڑاتے گھروں کی راہ لیتے اور کبھی کبھار تو اِدھر اُدھر گاڑیاں بھی مار دیتے۔اشوک بعض اوقات ٹُن ہو کر ہمارے ہاں چلا آتا۔بقول شیخو، من کا اچھا تھا، اسے کمرے میں آنے کی اجازت مل جایا کرتی۔اشوک بھی شیخو کا گرویدہ تھا۔شیخو کو شراب سے سخت چڑ تھی۔مگر وہ اپنی ناپسندیدگی کا کبھی اظہار نہ کرتا۔

اُس رات بھی جب سخت رنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی، شیخو اس جہاں سے روانگی برأت کی بات کر رہا تھا۔میری آنکھیں بھر آئیں۔شیخو جیسے دوست کو کھو دینا تکلیف دہ ہوتا۔اس کی عمر تو زیادہ نہ تھی، شاید پچاس برس کا رہا ہوگا۔مگر بیماریوں اور جسمانی حالت کے سبب فرعون رے مے سزا اوّل کا ہم مکتب دکھائی دیتا۔

اُس رات جانے کیا کیفیت تھی کہ اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ مجھے اس کی ایک وصیت پوری کرنا ہوگی۔میں تو ہچکچایا مگر اشوک نے جو جھومتا چلا آیا تھا، مجھے مجبور کیا کہ میں وعدہ کرلوں۔سلیم کا دل نہ توڑوں، مجھے وعدہ کرتے ہی بن پڑی۔اس نے ایک خاکی ڈبہ دیا کہ اسے میں اس کے سینے پہ رکھ کر ہی دفن کراؤں۔میری بھی جان میں جان آئی کسی کورے لٹھے یا مشہدی رومال میں لپیٹ کر میں اس کے بھائیوں سے وصیت کے بارے میں کہتا تو وہ غم کے عالم میں کوئی مذہبی کتاب سمجھ کر سلیم کے سینے پہ رکھنے کی اجازت دے ہی دیتے۔میں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے وعدہ کرلیا جس پہ سلیم مطمئن ہوگیا اور اشوک بھی کھل اُٹھا۔ جھٹ مجھے گلے سے لگایا۔پینے سے محبت بڑھ جاتی ہے۔تبھی جوش نے کہا تھا کہ باید ہے کہ سرکار خود شراب کشید کر کے شہریوں کو اچھی اور سستی شراب مہیا کرے۔اشوک راز دان تھا، اس

نے بتلایا کہ اس ڈبے میں انارکلی کی تصویر رہی ہوگی۔ سلیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

''بہت اکیلا اکیلا محسوس ہوتا ہے۔ دل خالی خالی رہتا ہے۔ پھر مجھے قربت کا احساس رہے گا۔ یوں ہزاروں برس وہ میرے ساتھ رہے گی۔''

اشوک نے لوہا گرم دیکھ کر ہتھوڑا مارا، ''اتنا قریبی دوست ہے۔ اسے تو بتلا دو راز اگلنے سے دل ہلکا ہوتا ہے۔ مسیحی دیکھو کیسے Confession box میں بول کر دل ہلکا کر لیتے ہیں۔''

سلیم چند لمحے متذبذب رہا۔ ''ہاں اب تو شاید یہ ایک ہی ماہ کی بات رہ چکی ہے، میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھ سے بہتر کون جانے کہ زندگی کتنے دن رہ گئی ہے۔''

میں نے تردید کرنے یا حوصلہ دلانے کی بات نہ کی۔ میں یہ راز جاننا چاہتا ہوں۔ سلیم قدرے توقف کے بعد بول پڑا۔

''صنوبر کے جنگلوں میں ہمارا گاؤں ہے۔ مگر ہم نے برساتی ندیوں اور پہاڑیوں سے زمین چھین چھین کر باغات بنا لیے جس کے باعث علاقے میں آسودگی آگئی۔ میرے ہی گاؤں کی لڑکی جو دور کی رشتہ دار بھی تھی مجھ سے محبت کرنے لگی۔ ہماری محبت احترام کے رشتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پروان چڑھتی رہی۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تک نہ تھاما۔ وہ میرے لیے اپنے ہاتھوں سے گلی بناتی کبھی مشہدی رومال تحفہ دیتی۔ ہماری محبت کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ ہماری ایک زمین جو دور کے پہاڑوں میں صدیوں سے ویران پڑی تھی، کوئلہ اُگلنے لگی۔ جس کے باعث ہم اچانک ہی امیر ہوگئے۔ میں نے شہر کی ماڈرن لڑکیاں دیکھیں؛ ڈائننگ ٹیبل پر چھری کانٹے سے کھانے والی لڑکیاں۔ چغتائی آرٹ کی مانند نازک اندام لڑکیاں۔۔۔ تو ایک ہی برس میں زرغونہ کی اہمیت جاتی رہی۔ اس کا نام زرغونہ تھا۔ اسے نئے طور طریقے نہیں آتے تھے۔ انگریزی نہیں بول سکتی تھی۔ فیشن تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ کسی امیر کبیر گھرانے کی شہری لڑکی

سے شادی بدرجہا بہتر رہی گی۔ ہاں وہ مجھے زرغونہ جیسی وارفتہ محبت تو نہیں دے سکے گی مگر دنیا میں ترقی محبت سے تو نہیں ہوتی۔ دنیا بھر میں بندوقوں کی، زرداروں کی حکومت ہے، مجھے اس طبقہ میں شامل ہونا تھا۔ میں زرغونہ کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ میں نے طویل بے اعتنائی سے کام لیا اور جب وہ بہت ہی مایوس ہوگئی تو میں نے اسے بتا دیا کہ میں بڑا آدمی بننے جارہا ہوں، میری زندگی میں اب اس کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ بہت روئی، بہت آنسو بہائے۔ مگر میں شہر کی رنگینوں میں کھویا رہا۔ پھر مجھے دل کا دورہ پڑا تو بستر پہ سوچنے کا موقع ملا۔ مجھے بیماریوں نے آ گھیرا۔ دوائیوں کے سائیڈ ایفکیٹس نے مار ڈالا۔ میں تقریباً اپاہج ہوگیا تو کسی طور پر اپنے گاؤں پہنچا۔ وہاں مجھ پہ دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا جو شاید جذباتی تھا۔ زرغونہ کی شادی ہوگئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی جا چکی تھی۔ گاؤں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صنوبر کے جنگل رو رہے تھے۔ زرغونہ کا گھر دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا۔ اب اس گاؤں میں رہنا دشوار تھا۔ میں واپس ہسپتال چلا آیا مگر مریض بن کر۔ بستر سے لگا رہتا اور زرغونہ کی یہ تصویر فریم میں لگا لی۔ اسی سے باتیں کرتا رہتا۔ پھر میں نے سوچا کہ مرنا تو مقدر ہے، کیوں نہ کوئی نیکی کا کام کرتا جاؤں۔ بیماری کے باوجود ڈاکٹروں کے لیے اپنے ہی اخراجات سے میس چلانے لگا۔ ڈاکٹروں کو ذہنی آسودگی ہوئی۔ ورنہ تو وہ ارد گرد کے ہوٹلوں میں جانے کیا کچھ کھایا کرتے تھے۔"

سلیم چپ ہو رہا۔

سسکیاں لیتا رہا۔

اشوک نے سکوت توڑا۔ "تمھیں شوق تو ہوگا کہ ایک بار زرغونہ سے ملا جائے؟"

سلیم کو اقرار کرتے ہی بن پڑی۔ "ہاں! دل چاہتا تو بہت ہے۔ مگر یہ ناممکن ہے۔ کراچی میں ہمارے لوگوں پہ حملے ہونے لگے۔ ان کے ہوٹل جلائے جانے لگے تو اس کا شوہر امریکہ چلا گیا۔"

امریکہ کا نام سن کر میں مایوس ہوگیا۔ مگر اشوک تو ٹن تھا۔ "دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں

ہے۔ تم جسے ممکن کہو وہی ممکن ہو جاتا ہے۔"

ماحول بہت غمگین اور فضا بہت بوجھل ہو چکی تھی۔ ہم دونوں اجازت لے کر چل دیے۔ سلیم بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملایا کرتا تھا۔ اُٹھنے کا یارا نہ تھا۔ اُٹھنا بیٹھنا اس کے لیے ایک صبر آزما مرحلہ ہوا کرتا۔ راہداری میں اشوک نے مجھ سے وعدہ لیا کہ کل میں سرِ شام چلا آؤں۔ وہ ایک اہم بات مجھے بتلائے گا، جس سے سلیم کو فائدہ پہنچے گا۔

وعدے کے مطابق میں سرِ شام اشوک کے ہاں جا پہنچا۔ اس کے دوست اب تک نہیں آئے تھے مگر وہ بوتل کھولے بیٹھا تھا۔

" میری باتیں غور سے سنو! پکا ہندو ہونے کا مطلب ہے کہ باقی دنیا کی تمام حقیقتوں سے انکار کیا جائے اور پکا مسیحی ہونے کا بھی یہی اصول ہے کہ دنیا کے تمام عقیدوں سے منہ موڑ لیا جائے۔"

اشوک کی زبان سے ایسے فلسفیانہ خیالات کے اظہار سے میں گرتے گرتے بچا۔ "یہ وِسکی ہے یا کہ عقل و دانش گھول کر پی رہے ہو۔ خیر آگے کہو۔"

اشوک نے سر ہلایا "ہندو جوگی دھوتی رماتے ہیں، جسے مچ کہتے ہیں۔ درہ بولان کے اندر ایک مچ تھا جسے تم لوگ کھجور کا ایک درخت کہنے لگے۔ وہاں تو درجنوں درخت ہیں۔ مچ تو تم ایک ہی درخت کو کہتے ہو۔ انگریزوں کے ملازم بلوچستان آئے تو انھوں نے اپنے تلفظ اختیار کر لیے؛ سیوی کو سبی، ثور آب کو سوراب، زرینڈا (پن چکی) کو زندہ رہ اور کالی پت کو خلیفت بنا دیا۔"

اشوک کی عالمانہ گفتگو سے میں بہت متاثر ہوا۔ "بہت اچھے! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے صاحبِ علم ہو۔ مگر اس کا ڈاکٹر سلیم سے کیا تعلق بنتا ہے؟ میں کہاں سے لاؤں زرغونہ۔ سلیم نے اس کا دل توڑ دیا۔ اس کی محبت کی توہین کی۔ اس کے پاؤں جا پکڑوں تو بھی نہیں آئے گی۔ عورت کی ضد بہت بری ہوتی ہے؛ راج ہٹ، بال ہٹ، تریا ہٹ۔"

اشوک نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بولنے روکا۔"پوری بات سنو! ہزاروں برس سے کالی دیوی کے دو مندر ہیں بلوچستان میں ۔ایک شہر اس کے نام پہ قلات کہلایا اور سلیم کے علاقے کا پہاڑ کالی پت کہلایا۔اس بلند پہاڑ پہ کالی ماں کا مندر ہے۔اس کے سیوک ایک کاسہ لیے پھرتے جس میں دو سیر گیہوں آتا۔اس کے سیوک صرف گیہوں کی روٹی کھاتے اور اپنا کاسہ بڑھا کر سوال کرتا؛ کالی پت! یعنی یہ پت کالی کا ہے،اس میں دو سیر گیہوں کا دان دو۔ پھر وہ اسی بلند و بالا پہاڑ پہ چڑھتے ہوئے کالی ماں کے مندر میں چلے آتے اور اپنی پوجا پاٹ کرتے۔لوگ اس پہاڑ کو بھی ان سیوکوں کے باعث کالی پت کہنے لگے۔جب وسط ایشیا کے مسلمان حملہ آور آنے لگے تو محمود غزنوی نے بامیان کے ڈیڑھ سو فٹ بلند بتوں سے نظریں چرائیں اور سومناتھ پہ حملہ کر دیا۔ مقامی آبادی نے مندر کو جو غار کے اندر تھا ، پتھروں خود رو جھاڑیوں اور جنگلی درختوں سے یوں چھپا دیا کہ چند سو برس گزرنے کے بعد ایک ہی خاندان کو نسل در نسل اس کا غار کا علم رہا جس کا دہانہ چھپا دیا گیا۔باقی دنیا لاعلم رہ گئی۔"

ڈاکٹر اشوک کی محویت، سنجیدگی اور لہجے کی سچائی کے باعث میں خاموش ہی رہا۔ کیوں کہ وہ ایک روانی میں بولے جا رہا تھا۔اس کے بیان میں صداقت سی محسوس ہوتی۔"اگر تم کالی پت یعنی کوہِ خلیفت جاؤ جس کا راستہ ہمارا ایک خاندانی راز ہے۔تو دیوی سلیم کے مرنے سے پہلے اس کی ملاقات زرغونہ سے کرا دے گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم راز کو راز ہی رکھو گے اور یہ راز بھی میں محض ڈاکٹر سلیم کے لیے افشا کرنا چاہتا ہوں۔کیوں کہ وہ ستو گنی ہے۔"

میں نے سوچنے کے لیے وقت لیا۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔مجھے ایک قدیم ترین مندر کا علم ہو جاتا جو کہ دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھا اور اگر واقعی کوئی کمال ہو جاتا جس کی مجھے قطعاً امید نہ تھی تو ڈاکٹر سلیم کو کس قدر خوشی ملتی۔ زیرِ تعلیم، ہاؤس جاب کرنے والوں کی میس کو کس لگن اور خلوص سے چلا رہا تھا۔مجھے تو وہ تھامس بیکٹ اور مدر ٹریسا جیسا عظیم انسان لگتا جس کی خاطر میں اس اقدام کے لیے تیار ہو گیا۔

اشوک نے بتلایا کہ کالی کے مندر کولکتہ، قلات اور کالی پت میں ہیں۔ یہ دیوی موت اور وقت کا مظہر ہے۔ مگر ماں بھی ہے، اپنے اٹھارہ ہاتھوں سے مدد کرتی ہے۔ بہتر دن سوموار، بدھ اور ہفتہ ہیں۔ کوئی اس کے چرنوں پہ پھول چڑھائے، بکرے کی بلی دے تو کام ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ داستانوں جیسا لگا مگر سلیم کی خاطر ایک تجربہ کرنے میں کیا حرج تھا۔ اشوک نے یہ حلف بھی لیا کہ میں نہ مندر کی بات کسی کو بتاؤں گا اور نہ ہی کبھی راستہ بتلاؤں گا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اشوک کو مجھ پر بھروسہ تھا۔ ہمارے اولین وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل نے جن انسان دشمن زیادتیوں کے باعث احتجاجاً جناح بابا کو استعفیٰ دیا تھا، ان میں کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کے اغوا اور لڑکیوں سے زبردستی شادی روز کا معمول تھا۔ قیامِ پاکستان کے وقت کوئٹہ میں 39 مندر اور گوردوارے تھے جسے پراپرٹی مافیا نگل گیا۔ ایسے میں اشوک کی ہم سے ہمدردی اور بھروسہ ایک اعزاز سے کم نہ تھا۔

مندر کا ایک راستہ اغبرگ سے تھا اور دوسرا زیارت سے گزر کر ژڑی سے۔ وہ مجھے نسبتاً آسان لگا۔ کیوں کہ اغبرگ کا راستہ پیدل کا تھا۔ پہاڑی دراڑوں اور برساتی ندی نالوں سے گزرنا پڑتا۔ جب کہ زیارت اور پھر ژڑی تک ایک اچھی سڑک تھی۔ جس سے میری جیپ با آسانی گزر جاتی۔ میں احتیاطاً کولٹ 44 میگنم اور ایک کلاشنکوف کے علاوہ پھولوں کے ہار، وہسکی کی ایک بوتل ساتھ لیتا گیا۔ ژڑی سے دو پگڈنڈیاں کالی پت کی چوٹی پہ جاتی ہیں۔ میں نے یہاں بھی نسبتاً کم چڑھائی والی پگڈنڈیاں اختیار کی۔ شام کے قریب میں غار کے دہانے تک پہنچ گیا۔

اس بلندی پہ جو گیارہ ہزار فٹ سے کم نہ تھی، چند ایک جھونپڑیاں تھیں جن کے مکین صدیوں سے غار کے دہانے کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر اشوک سے حاصل کردہ قدیم ہار اور رد راکش دکھایا تو وہ رام ہو گئے اور غار کے اندر لے گئے، جو کسی طور نظر نہیں آتی تھی۔ یہاں کالی کا ایک بہت بڑا بت سیاہ پتھر کو تراش کے بنایا گیا تھا۔ غار میں بڑے بڑے پتھریلے

طاق روشن تھے۔ جنھیں ہزاروں برس سے جانے کہاں سے تیل مل رہا تھا۔ شاید اسی پہاڑ کا تیل کسی طور پر رِس رِس کر آ رہا تھا۔ اس غار میں ایک خوف ناک سناٹا تھا۔ کالی ماں کی مورتی کے سامنے جاتے ہوئے تو میں بے حد خوف زدہ ہو گیا۔ میں نے سپشک کے بعد پھول چڑھائے، اور وہسکی کی بوتل قدموں میں پھوڑی۔ اشوک کے الفاظ دہرائے باقی ہر دیوی تو شاکاہاری ہے۔ جب کہ کالی ماں تو بلی بھی مانگتی ہے۔

میں اُلٹے قدموں غار سے باہر چلا آیا۔ پہاڑی وادیوں پہ گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ فضا میں شنشوب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ غرضیکہ نہایت ہی خوف ناک منظر تھا۔ غار کے باہر پتھروں کے حجرے تھے جن میں ان جانے اوپاسک قدیم لباس میں ملبوس پر اسرار انداز میں تپسیا کر رہے تھے۔ وہاں کمروں میں آتش دان روشن تھے۔ مشعلوں سے لرزتا ہوا ماحول نہایت بھیانک لگ رہا تھا۔ میں نے اشوک کا پُر اسرار ہار دکھایا تو وہ اپاسک تعظیماً ڈنڈوت کرنے لگے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی جواباً میں نے بھی دل پہ داہنا ہاتھ رکھا اور جھک سا گیا۔ سارا ماحول پر اسرار اور حیرت انگیز تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے میں راجہ دشنیت کے دور میں چلا آیا ہوں یا چندرگپت موریہ کے عہد میں جس نے یونانیوں سے یہ علاقہ بزورِ شمشیر چھین لیا تھا۔ ادب آداب کے بعد میں ان سنگی حجروں سے باہر چلا آیا۔ دھواں لوبان کی خوشبو مشعلیں جلنے سے پیدا ہونے والی حرارت غرضیکہ ایک ملا جلا تاثر دیومالائی تھا۔

باہر نکل کر میں نے بوٹ پہنے۔ پہاڑوں میں بھیڑیوں کی آوازیں خاصی قریب محسوس ہو رہی تھیں۔ جن کے مقابلے میں میرے میزبانوں کے کتے نکل آئے تھے۔ بھونک بھونک پر وہ بھیڑیوں کو اپنی موجودگی سے خبردار کر رہے تھے۔ ہوا کے تیز و طرار جھونکے اس پہ مستزاد۔ میرے میزبانوں کا گزر بسر بھیڑ بکریوں پہ تھا۔ پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ سادہ سی زندگی بسر کرتے اور کسی اجنبی کو اپنی حدود میں داخل نہ ہونے دیتے۔ کم کم گفتگو کرتے۔

ان کے کمرے میں جو پتھروں کا تھال کھالوں کے بستر پہ ڈھیر ہو گیا۔

اگلی صبح ان کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہوا۔ پگڈنڈیوں سے جو خاصی دشوار گزار تھیں، محتاط انداز میں چلنا پڑا۔ ایک ذرا سی غلطی اندھیری عمیق کھائیوں میں گرا دیتی۔ رات کے ہیبت ناک ماحول کا اثر دل پہ طاری رہا۔ جیب محفوظ تھی، ایک انگڑائی سی لے کر جاگ اُٹھی۔

واپسی پہ میں اشوک سے ملا، اس کا ہار لوٹا دیا۔ وہ بہت مطمئن سا لگ رہا تھا۔ واقعات اس نے کرید کرید کر پوچھے۔ میں نے بتلایا کہ داخل ہوتے ہی گھنٹہ بجا کر جے ماں کالی کہا تھا تو وہ خوش ہوا۔ چٹکی بجا کر بولا شیخو کا کام بن گیا۔

شیخو کی حالت بگڑ رہی تھی۔ مگر اس نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ وارڈ کے بستر میں مرنے کی بجائے وہ منا ڈے اور ہیمنت کمار سنتے ہوئے اپنے کمرے میں ہی جان دے گا۔ درد کی شدت اس کے چہرے پہ سمٹ آتی مگر وہ گیت بھی سنتا رہا۔

شہر خاصا گرم تھا۔ ہسپتال گرمی سے پھنک رہا تھا۔ جلتے ہوئے پہاڑوں سے بادِ سموم کے جھکڑ اس پیالہ نما داری میں در آتے۔ بہت عرصہ ہوا بادل یہاں کا رُخ نہیں کر رہے تھے۔ لوگ باگ کہتے کہ ہم جو ایٹمی طاقت بنے ہیں، ایٹمی دھماکہ کیا، یہ اسی کی ناطاقتی ہے، نہ بارش نہ پانی، ایٹمی طاقت والے العتش العتش پکار رہے تھے۔ ہر طرف قحط سا پڑ گیا تھا۔ یوں بھوکوں مرنے سے تو بہتر ہوتا کہ ایٹم بم کو ہی پان کی مانند چبانے لگتے۔ صوبے بھر کی فضا پہ عزیز مصر کے خواب والی AI NENO طاری تھی۔ یہ گرم ساکت ہوائیں بادل نہ بننے دیتیں اور گماں تھا کہ سات سوکھی سڑی بھینسیں جنھیں دیکھا تو عزیز مصر نے تھا، اس کی مصری بیوی آسناتھ کے پاس جانے کی بجائے ہمارے ہی پاس چلی آئی ہو۔ سات برس کا قحط ہمارا مقدر بن چکا تھا۔ آڑ نجی میں بھی قحط پڑ گیا تھا۔ لاشیں گرنے لگی تھیں۔

ایک ایسی ہی مسموم سہ پہر میں جب کہ لال آسمان آگ برسا رہا تھا، مجھے اشوک کا فون آیا۔ بالکل مختصر سا مگر دل ہلا دینے والا۔ ”شیخو کی طبیعت خراب ہے، جلدی سے چلے آؤ۔“

میرا ماتھا ٹھنکا اور باہر بھاگا۔ جیپ دوڑاتا ہسپتال چلا آیا۔ معلوم ہوا کہ شینو کا دل گھبرانے لگا تھا، وہ اشوک کے ساتھ پارکنگ میں نکل آیا اور ایک بینچ پہ آبیٹھا۔ خانساماں اور ملازم حواس باختہ دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اشوک نے اطمینان کی سانس لی۔ شینو نے بھی مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ کئی روز سے اس نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ اسی ہیئت کذائی میں ہی باہر چلا آیا تھا۔ باہر روشنی میں چلے آنے کے سبب ان کے داغ دھبے شکنیں زیادہ ہی نمایاں تھیں۔ سوجے ہوئے پیروں میں ہوائی چپل۔ اس کی حالت دیکھ کر بہت ہی دکھ ہوا۔ ہم نے چائے لانے کو کہا اور پھر وہیں بینچوں پہ چائے کے مگ تھام لیے۔ درختوں کی چھاؤں بھلی لگ رہی تھی۔

اچانک ہمارے مقابل پارکنگ میں سیاہ رنگ کی چمکتی دمکتی کراؤن لکسل کار آن رُکی۔ یوں لگتا تھا کوئی سربراہ مملکت بی پی چیک کرانے چلا آیا ہو۔ کار کا ڈرائیور دائیں بائیں نگاہ دوڑاتا ہمارے پاس چلا آیا اور مؤدبانہ انداز میں ڈاکٹر سلیم کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے شینو کی جانب اشارہ کرتے بتلایا کہ یہی ڈاکٹر سلیم ہیں۔ کیوں کہ شینو بولنے کے قابل نہ تھا، جانے کیسے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ مؤدب ساڈرائیور کار کے پاس پلٹا، اس نے پچھلا دروازہ کھولا اور کچھ گفتگو کی جو ہم سن نہ پائے۔

معاً کار سے ایک بے انتہا خوبصورت اور پروقار خاتون ایک شانِ دلربائی سے چلتی ہوئی ہمارے پاس چلی آئی۔ جیسے کرشن بھگوان نے اپنے سارے روپ ارجن کو ایک ساتھ ہی دکھائے ہوں۔ ہم دم بخود رہ گئے۔ دھوپ کا قیمتی چشمہ اس کی آنکھوں پہ تھا۔ جس کے آسمانی شیشوں سے اس کی قیامت خیز ہوش ربا آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ میکبتھ کو اس قدر حیرت تو Great Birnam Wood کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر نہیں ہوئی ہوگی، جتنی کہ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔

اشوک اور میں احتراماً کھڑے ہو گئے۔ مگ بدستور ہمارے ہاتھ میں رہے۔

وہ شیخو کے پاس آئی۔

"ڈاکٹر سلیم! مجھے پہچانا؟" اس کے لہجے میں آگ تھی، طنز تھا۔

شیخو نے سر نفی میں ہلایا اور موٹے موٹے سیاہ شیشوں والی عینک سے متعجب ہو کے اسے دیکھا۔ پہلے تو اس خاتون کی آنکھوں میں کاٹ تھی، لہجے میں فخر تھا، ایک احساسِ برتری تھا۔ مگر شیخو کی حالت دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ آواز بھی گلو گیر ہوگئی، جیسے رو ہی دے گی۔ "مجھے پہچانا سلیم؟" اس نے امریکن لہجے کی انگریزی میں دوبارہ سوال دہرادیا۔

پھر وہ خود ہی بول پڑی، "تمھارے گاؤں کی ایک غریب اَن پڑھ لڑکی تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یاد ہے وہ لڑکی؟"

سلیم تڑپ اُٹھا۔ "ہاں! زرغونہ! کہاں ہے وہ؟"

وہ خاتون آنسو پی کر بولی۔ "میں ہی ہوں وہ زرغونہ"۔

ایک قیامت گزر گئی۔

آنسو روکنے کی کوشش میں پروقار انداز میں پلٹی اور کار میں جا بیٹھی۔

اُدھر کار مڑی، اِدھر ایک چھناکا ہوا۔۔۔ سلیم کے ہاتھوں میں مگ گر کر ریزہ ریزہ ہوگیا۔ سر ڈھلک گیا تھا۔

"سنبھالو اشوک!" میں لپکا مگر مگر اشوک نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جذباتی ہونے سے روکا۔

"اسے اس جنم سے مکتی مل گئی ہے۔ آخری خواہش بھی پوری ہوگئی۔ تم کالی پت جانے کی فکر کرو۔ بکرا تم لیتے جانا بوتل میں دے دوں گا۔"

چاند گرہن

سپنا میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ناصر اسے دیکھ کر دیوانہ سا ہو گیا۔ وہ سب سے مختلف اور دل ربا تھی۔ غالبؔ کی غزل جیسی بانکی چتون۔ عدمؔ کی شاعری جیسی چھوٹی بحر کی قیامت۔ ناصر نے خود پہ قابو پانے کی بہت ہی سعی کی مگر دل تھا کہ اخلاقیات کی نہ ہی سنتا۔ ناصر کو شعبہ انگریزی میں کام کرتے پانچ برس ہو چکے تھے۔ قسمت اچھی تھی کہ پانچ ہی برس میں اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر ترقی ہو گئی۔ کیوں کہ دیگر صوبوں سے آئے ہوئے اساتذہ کا قتل عام جاری رہا تھا۔ نہایت ہی اطمینان سے Patricide اور کبھی کبھار Matricide کرتے رہے۔ باقی بچنے والے اساتذہ خوف زدہ ہو کر ریٹائرمنٹ پہ چلے گئے یا دیگر یونیورسٹیوں کی راہ لی۔

اظہارِ محبت میں یہ استاد شاگرد والا رشتہ خاصا تکلیف دہ احساس دلاتا۔ افشائے راز پہ ملازمت جانے کا بھی خدشہ تھا مگر سپنا کے لیے تو کئی بار جان بھی دی جا سکتی تھی۔ لیکچر کے آخر میں وہ کوئی سوال کرتی تو ناصر سارا انگریزی ادب بھول جاتا۔ اسے یوں لگتا وہ کلمت کے پاس بحر بلوچ کے گہرے اور شفاف پانیوں میں اُترتا جا رہا ہے۔ سپنا سے نگاہیں ملا کر ان آنکھوں میں ڈوب کر ناصر مدہوش سا ہو جاتا۔ حتیٰ کہ اسے سپنا کی آنکھوں کی Addiction سی ہو گئی۔

یونیورسٹی میں چھٹیاں ہوتیں، کسی طالب علم کی گمشدگی یا قتل پہ یونیورسٹی بند ہوتی تو ناصر کو بے کلی سی ہونے لگتی۔ اس کا دل چاہتا ہر جانب سپنا کی آنکھیں ہوں۔ شمشوب پہ، گوا رخ پہ گلاب کی بیلوں اور کہیر کی ڈالیوں پر اور یہ آنکھیں اس پہ ہی مرتکز رہیں۔ اس نے صوفیا کا قول پڑھ رکھا تھا کہ سچا عاشق راہِ عشق میں مارا جائے عاقل خان کی مانند تو وہ بھی شہادت کا رتبہ پاتا ہے۔ جب درجنوں ہی انسان مارنے والے خودکش حملہ آور جنت کے طلب گار نظر آتے ہیں تو سپنا کی خاطر اپنی جان دے کر وہ بھی شہید راہِ عشق قرار پاسکتا ہے۔

چھ ہی ماہ میں اس کی پروفیسری، اس کی شرافت، کردار کی عظمت جاتی رہی۔ اس کے اندر کے انسان نے پروفیسر کو اغوا کر لیا۔

ایک روز جب کہ بارش ہو رہی تھی، اسے راہداری میں سپنا دکھائی دی۔ جانے کس خیال سے سپنا نے مڑ کے دیکھا۔ ناصر بمشکل تجلی طور برداشت کر پایا۔ راہداری خالی تھی۔ بارش کے سبب حاضری کم تھی۔ سپنا احتراماً ٹھہر گئی۔ ناصر اس کے قریب آیا تو دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ناصر نے ملازمت سے استعفیٰ پر دستخط کر دیے۔

''سپنا! میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' خلافِ توقع سپنا کو حیرت نہ ہوئی۔ نہ ہی وہ پیر پٹختی ڈین یا وی سی کے پاس شکایت لگانے کے لیے مڑی۔

''ہاں میں جانتی ہوں'' اور پھر سامنے سے آتے طلبا کو دیکھ کر وہ لاتعلقی سے چلنے لگی۔

ناصر اپنی خوشی چھپانے کے لیے کلاس کے بعد بارش میں ہی نکل گیا۔ پیاسی بالو مینہ کی بوندوں سے سوندھی سوندھی خوشبو دے رہی تھی یا شاید زمین اچانک جاگ اُٹھی تھی۔ اس خلافِ اُمید کامیابی نے تو ناصر کی شخصیت ہی بدل کر رکھ دی۔ بہت خوش خوش رہنے لگا اور اس کی والدہ نے تو سپنا کے گھر جا کر عندیہ بھی دیا کہ وہ سپنا کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہے۔ رہی اُستادی شاگردی کی بات تو ایم اے کے بعد سپنا یونیورسٹی نہیں جائے گی، چپ چپاتے شادی کر لیں گے۔ شادی کے بعد یہ قابلِ اعتراض خبر پھیلی بھی تو اس کا شدید ردِ عمل نہ ہوگا اور کون جانے کتنے

پروفیسر اپنی طالبات پہ یوں ہی مرتے ہیں، شادی نہیں کرتے۔ سپنا کے والد نعیم کو بھی رشتہ مناسب لگا۔ ناصر ایک شریف انسان تھا اور شریف انسان اپنی شرافت کے جالے کے اندر ہی رہتے ہیں۔ مکڑی کی مانند اپنے جالے میں اپنی ایک بیوی کے ساتھ رہتے ہیں، اِدھر اُدھر نہیں دیکھتے۔ اس نے حوصلہ افزا رویہ رکھا کہ سوچ کر کوئی جواب دے گا۔ یوں انتظار کی طرح ڈال دی۔

دن بہت ہی رنگین اور دلکش ہو گئے تھے۔ موبائل ہی ان کا رازداں پیامبر اور قاصد تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں ہوتیں۔ گاہے گاہے مل بھی لیا کرتے۔ ناصر شادی کے ایک برس تک معاملہ اخفا میں رکھنا چاہتا تھا۔

پھر ایک روز اچانک ہی نعیم کی لاٹری کھل گئی۔ مولا جب بھی دیتا ہے، چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ نعیم کا ایک آوارہ منش بھائی جسے خاندان نے دھتکار دیا تھا، والد نے عاق کر رکھا تھا۔ وہ لندن میں چل بسا تھا۔ ڈرگ مافیا سے تعلق تھا۔ کروڑوں کی آسامی تھی۔ اس کا اکلوتا وارث نعیم ہی تھا۔ سرکار کا خط ملا اور بتلایا گیا کہ انگلینڈ کے سفارت خانے سے رابطہ کرے۔ اسے سرکاری طور پر ٹورسٹ ویزا دیا جائے گا۔ بھائی کی جائیداد اور اکاؤنٹ وغیرہ اپنے تصرف میں لائے۔ یہ اندوہ ناک خبر دولت کی جھنکار ساتھ لائی تو سارا گھرانا فرطِ مسرت سے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ بارے نعیم نے خود کو سنبھالا۔ سفید چادریں بچھا بیٹھک میں مرحوم بھائی کی فاتحہ لینے لگا۔ اپنی مسرت اپنے قہقہے چھپانے کے لیے وہ طرح طرح کے حیلے کرتا اور بظاہر تو وہ سوگوار دکھائی دینا چاہتا تھا مگر مسرت تھی کہ چھپائے نہ چھپتی۔

ناصر کو جو سپنا نے تایا کی موت کی خبر سنائی تو اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ ناصر ان کے ہاں فاتحہ کے لیے آیا۔ قارون کے مرنے کی خبر دوست و دشمن سبھی تک پہنچ چکی تھی۔ جس پہ وہ قدرے حیران بھی ہوئے۔ مگر ناصر تو خوف زدہ بھی ہو گیا۔ سپنا کی شخصیت میں بے حد تبدیلی آ گئی تھی اور اس کی آنکھیں تو بالکل ہی بدل گئی تھیں۔ یہ وہ آنکھیں نہ

تھیں جانے کیا ہوا تھا۔

ان ہی دنوں ناصر کے ایک خبطی چچا نے اُسے بلوا بھیجا اور آگاہ کیا کہ وہ دفینے تلاش کرتا رہتا ہے، اب چوں کہ بوڑھا ہو چکا تھا اس کے بازوؤں میں اتنی سکت نہیں رہی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ناصر کو شریک راز کرے اور پچیس فیصد حصہ دیا کرے۔ ان مقامات تک لے جانا، ڈرائیو کرنا، بیلچہ کھدال چلانا وغیرہ ناصر کا ہی کام ہوگا۔ صرف ایک ہی شرط ہوگی: اخفائے راز۔ یہ ایک دُور کا چچا تھا، رشتے کا چچا اور اس نے بھی کوئی ملازمت یا کاروبار نہ کیا تھا۔ مگر ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ شادی بھی نہ کی تھی۔ وہ ایک مستقل مکان یا بیوی رکھنے کا مخالف تھا۔ شادی کو وہ غلامی کی ہی ایک صورت قرار دیتا۔ اس راز سے پردہ اٹھنے کے بعد چچا اسے وہی پراسرار اور الہٰ دین کا چچا لگنے لگا جس نے اسے جادوئی چراغ دلایا تھا۔

نعیم کے بعد اب ناصر اسی صورت حال کا شکار ہو گیا۔ وہ خود کو خزانوں کا مالک سمجھنے لگا۔ ہیرے جواہرات سونا چاندی، ہیروں کے ہار پہنے سپنا اس کے پہلو میں ہوگی اور وہ عرب شیوخ کی مانند قیمتی کاریں دوڑاتا یونیورسٹی کے پاس زن سے گزر جایا کرے گا۔ سپنا تو دولت مند ہو ہی رہی ہے، وہ خود بھی دولت مند بن جائے گا۔ نعیم کی ہی ٹکر کا ہوگا۔ کیا عجیب زیادہ امیر کبیر ہو جائے۔

چچا کے ساتھ پہلی مہم کامیاب رہی۔ چچا نے دمب کے جس مقام کی نشان دہی کی تھی، وہیں سے چاندی کے روپوں سے بھرے دو مٹکے برآمد ہوئے۔ خریدار چچا کے پاس موجود تھے جو جیبوں میں روپیہ لیے پھرتے۔ چچا تو چاندی سونا وزن پہ بیچتا جب کہ بیوپاری وہی مال اینٹیک میں بولی لگا کر فروخت کرتے اور چوکھا کام کماتے۔ دفینے تلاش کرنا ایک دلچسپ اور پراسرار مشغلہ تھا۔

سپنا دولت ملنے سے پہلے ہی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی تھی۔ ڈیفنس میں گھر خریدنے اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ جانے کا ذکر کرتی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ پورا شہر ہی خرید ڈالے گی۔

ناصر کو یہ باتیں گراں گزرتیں۔ محبت کی بجائے سپنا چیزیں خریدنے کا سوچنے لگی تھی اور جب نعیم معاملات طے کر کے انگلینڈ سے لوٹا تو اس نے فوراً ہی کینٹ میں ایک بڑا سا بنگلہ خرید لیا۔ گرینڈ بھی یوں خریدی کہ اس کا ڈرائیور اور گن مین بھی ساتھ ساتھ ہی رہتے۔ وہ ناصر کو بھی بڑے ہی مربیانہ انداز میں ملا۔ سب کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ نعیم، مغل اعظم کے انداز اختیار کر چکا تھا۔

اسی دوران چچا نے خاصا کما کر دیا تھا اور مستنگ کے منہدم شدہ شہر اور رنگ آباد اور کھڈ چہ کے مابین ایک دفینہ تلاش کر لیا تھا۔ اس کے گھر میں قدیم نقشے، قلمی نسخے اور ڈھیروں کتابیں پڑی رہتیں۔ جنھیں کھنگالنے کا فن وہی جانتا تھا۔ کھدائی کا کام وہ رات میں کیا کرتے۔ جیپ کہیں جھاڑیوں یا نشیب میں چھپا دیا کرتے۔ ناصر جلد از جلد امیر بننا چاہتا تھا۔ بدلتے ہوئے حالات میں تو وہ سپنا کا ایک دن کا خرچہ بھی برداشت نہ کر پاتا۔

ایک رات کھڈ کوچہ کے قریب کھدائی کرتے انھوں نے بہت سے مسلح لوگ دیکھے۔ وہ جھاڑیوں میں دبک کر ان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن ان لوگوں نے گزرنے والی بسوں کو روکا، مسافروں سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ پھر انھیں گولیوں سے اڑانے لگے۔ چچا یہ ظلم برداشت نہ کر پایا اور اپنے ریوالور کے دستے پہ گرفت جما کر گرجتا ہوا جھاڑیوں سے باہر نکلا۔ اس کی چھ گولیوں سے جانے کون زخمی ہوا۔ مگر ناصر نے اسے گھائل ہو کر تو گرتے دیکھا۔ خون کی ہولی کے بعد حملہ آور کچھ لوگوں کو یرغمال بنا کر پہاڑوں کی جانب نکل گئے تو ناصر بھی ڈرتا سہما باہر نکلا۔ اندھیرے میں وہ ٹارچ کی روشنی کی مدد سے چچا کو تلاش کرتا رہا۔ ہر جانب خون میں لت پت انسان پڑے تھے۔ چچا کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔ دفینوں کا راز سینے میں ہی لیے ہوئے وہ چلتا بنا تھا۔ بے نور آنکھوں سے وہ سیاہ آسمان کو دیکھے جا رہا تھا، ریوالور پہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔

ناصر کانپ کانپ اُٹھا۔ اچانک اسے مرے کٹے انسانوں سے خوف آنے لگا۔ وہ سڑک کی جانب بھاگتا چلا گیا۔ آخر وہاں پہنچ کر وہ بے دم ہو کر گر پڑا۔ اس کا حلق خشک ہو رہا

تھا، حلق میں کانٹے پڑ چکے تھے۔ اس نے سوچا بھگوان سے بہتر ڈرامہ نگار تو شیکسپیئر ہے جس نے محض 37 ڈرامے ہی لکھے۔ مگر ان ڈراموں کے بیچ بیچ میں Jester اور Clown ظاہر ہو کر تماشائیوں کو ہنسا ہنسا کر المیہ کی کیفیت اور شدت جذبات کم کرتے رہتے ہیں۔ اس ملک سے تو گلوب تھیٹر ہی بہتر تھا۔

اس کا حلق پیاس سے خشک ہو رہا تھا، سینہ جل رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کولرج کی نظم اس کے کانوں میں گونج دار آواز سے در آئی یا شاید یہ اس کے ہی من کی آواز تھی۔

The souls did from bodies fly

They fled to bliss or woe!

And every soul, it passed me by

like the whizz of my cross bow!

گھبرا کے ناصر بڑبڑانے لگا۔ مگر طوفانی ہواؤں جیسا شور تھا Clamour تھا۔

I looked to heaven and tried to pray

But or ever a prayer had gusht

A wicked whisper came, and made

My heart as dry as dust

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ ہزاروں برسوں سے پیاسا اسی سڑک پہ پڑا ہے۔ اسے بے گناہ مقتولوں سے خوف آنے لگا تھا۔ زندہ انسان مردہ انسانوں سے جانے کیوں ڈرتے ہیں۔ حالاں کہ وہ تو اپنے قاتلوں کی نشاندہی بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اس نے یہ سوچا تو ہمت کر کے جیسے تیسے چلتا ہی چلا گیا کہ آگے شاید اسے پانی مل ہی جائے۔ اسے صحرائے ربذہ میں مقید ہونے کا احساس ہونے لگا۔ پھر یک دم روشنی کی کرن چمکی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے نشیبی جھاڑیوں میں جیپ چھپا رکھی ہے۔ جس میں پانی کی بوتلیں بھی ہیں۔ اس قتل گاہ سے گزرتے تو خوف آ رہا تھا۔

لہٰذا وہ ایک طویل چکر کاٹ کر جیپ تک پہنچا اور بوتل حلق میں انڈیل لی۔ہوش و حواس بجا ہونے لگے۔مگر وہ بے رحم،سفاک اور پراسرار نظم پاگل کیے دے رہی تھی۔

The look with which they looked on me

Had never passed away

And orphan's curse would drag to hell

اس نے سر جھٹکا مگر جادوئی نظم اس کے دل میں اُمنڈے چلی آ رہی تھی۔

Is the curse in a dead man's eye!

Seven nights I was the curse

And yet I could not die

اس کا سر بوجھل ہونے لگا۔وہ ایک بڑا جھوٹ پڑھتا اور پڑھا تا رہا تھا۔صرف ایک Albatross کو قتل کرنے سے سمندر جامد ہوگیا۔فضا ساکت ہوگئی،بحری جہاز کے ملاح ایک ایک کر کے مارے گئے،سمندر خفا ہوگیا،قدرت ناراض رہی۔یہاں تو ہزاروں انسان مارے جا رہے ہیں۔اسکولوں کے معصوم بچے،گشت کرتے سپاہی،پہاڑوں صحراؤں کے باسی ،تفتیش کے لیے اغوا شدہ نوجوان سبھی بے دردی سے قتل کیے جا رہے ہیں۔مسخ شدہ لاشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا ہے۔ایک پرندے کے قتل کے ہونے والی قدرت اب برہم کیوں نہیں ہوتی۔جس نے انسان کو اپنی ہی شکل پہ پیدا کیا ہے اور شہروں شہروں بھیروں ناچ رہی ہے اور کالرج پھر اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا۔اس کا جی چاہا وہ چیخ چیخ،کر ساتھ ساتھ دہراتا چلا جائے۔

O let me be awake , my God!

Or let me sleep away

کالرج گنٹھیا کا مریض ہونے کے سبب افیون چاٹتا تھا۔عجب پینک میں اس نے سب کچھ

محسوس کیا ہو۔جانے ہمارے لوگ بھلا افیون کیوں نہیں کھاتے ۔کتنی اذیت کم ہو سکتی ہے ۔ میکبتھ کی آواز دور سے چلی آئی :

Thy bones are marrow lesss, Thy blood is cold ;

Thou hast no speculations in those eyes

Which thou dost glare with

ناصر تھا اور ہواؤں کی سرگوشیاں تھیں۔

پُر اسرار اندھیرا تھا۔

وہ موت کے پہلو میں بیٹھا تھا۔

جھری جھری سی آئی۔

مقتولین اپنی نے جان آنکھوں سے آسمان کو دیکھ رہے تھے ۔آسمانوں سے تو اب فرشتے نہیں بلکہ اندھی گولیاں اُترتی ہیں ۔رحم کر آسمان گانے والے اب آسمان سے راکٹ گرتے دیکھتے ہیں۔خاموش ڈرون بالکل بے آواز سے آسمانوں سے نمودار ہو کر مارے ڈالتے ہیں۔آسمان قابیل بن گیا ہے۔

پھر صدیوں بعد سپاہی چلے آئے،وہ ٹرکوں سے کود پڑے ۔ناصر نے سر جھٹکا۔کولرج والا افیونی واہمہ بھی تو ہو سکتا ہے۔کیا عجب نیچر نے اپنے نمائندے وردی میں بھجوائے ہوں کہ زخم مندمل کر دیں ۔اپنی میحائی سے سب کو زندہ کر دیں ۔ جیسے یسوع نے حکم دیا تھا؛ ''تالیتا کومی'' مگر میحاؤں کے ہاتھوں میں تو بندوقیں نہیں ہوا کرتیں ۔سپاہی اِدھر اُدھر پھیل گئے ۔سگرٹیں سلگا کر تبصرے کرنے لگے ۔مقتولین کی نقدی اور قیمتی اشیا کے لیے چھینا جھپٹی بھی ہونے لگی ۔وہ حق بجانب ہی تھے ۔کیوں کہ مردہ کی بجائے زندہ انسان کو مادی اشیا کی زیادہ ضرورت ہوا کرتی ہے ۔ناصر بری طرح سے پھنس چکا تھا۔سامنے آتا تو پوچھ گچھ ہوتی ۔اسی کے ذریعے شناخت پریڈ کروائی جاتی اور وہ مفت میں مارا جاتا۔ دبکے رہنے میں ہی عافیت تھی۔

اس نے طلبا کو سانکو پانزہ اور Don Quixote پڑھایا تو تھا۔ مگر خود اس نے کبھی ہیرو بننے کی کوشش نہ کی تھی۔ نہ تو اتنی سکت تھی اور نہ ہی ضرورت۔

مگر سپاہی اپنا دائرہ عمل بڑھا رہے تھے۔ پکڑے جانے کی بجائے بھاگ نکلنا بہتر ہوگا۔ بتیاں جلائے بغیر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ سپاہی چونکے، متوجہ ہوئے، فائر کھول دیا۔ وہ اندھیرے اور نشیب و فراز کا فائدہ اُٹھاتا بھاگ نکلا۔ کچھ دور جا کے اندازہ ہوا کہ ہوا دائیں بائیں اور سر کے اُوپر سے گزرنے والی گولیوں نے جیپ کا ونڈ سکرین توڑنے کے علاوہ خاصا نقصان بھی پہنچایا ہے۔ نامانوس متروک اور اجنبی راہوں سے دھول اڑاتا وہ زندہ سلامت گھر پہنچ ہی گیا۔ جیپ پہ ترپال ڈال دی۔

اب وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا۔ چچا کو تو بس کا مسافر ہی سمجھا جاتا۔ وزیر اعلیٰ کی ہاتھ اُٹھائے فاتحہ کرتے، ایک نئی تصویر اخباروں میں چھپتی۔ اور چند ہی روز میں لوگ بھول بھال جایا کرتے۔ ہاتھ اُٹھا کر دعا کرنے کا رواج جنرل ضیا نے دیا تھا جو افغانستان کے باب میں نادر شاہ افشار بن بیٹھا تھا۔ نادر شاہ کی مانند ہی وہ موتی مسجد میں پہلو میں تلوار رکھے براجمان رہا۔ یہ پوز بہت مقبول ہوا۔ پھر تو یہ فیشن ہی چل نکلا۔ بسوں کے مقتولین کے لیے بھی ایسی تصویر چھپنے سے لوگ بہت مطمئن ہوتے۔ انھیں خوشی ہوتی کہ مرحومین کے لیے دُعائیں ہو رہی ہیں۔ سارے محمود خان گوندکش ہاتھ اٹھا کر دعا کا پوز پریس کے لیے بنواتے۔

ناصر کے نظریات بری طرح مجروح ہوئے تھے۔ وہ من ہی من کانپتا رہا۔ اسے اسپلنجی، جوہان، نرمک، سارون، روبدال میں بے گور و کفن لاشیں دکھائی دیتیں اور اسے تاسف ہوتا رہا کہ وہ اس سنجیدگی سے The Rime of anciet mariner پڑھتا پڑھاتا رہا ہے لیکن ملازمت کی خاطر اسے یہی نظم نہایت ہی پر تاثیر انداز میں آئندہ بھی پڑھنا ہوگی۔ ظاہر ہے کہ پیاز کی ریڑھی لگانے سے تو رہا۔ ہوسکتا ہے کہ نیچر بھی کالونیل ہوگئی ہو۔

چچا کی شناخت ہوگئی۔ مگر وہ وہاں پہنچا کیوں کہ یہ ایک اہم سوال تھا۔ کیوں کہ باقی

مسافروں سے ۔بہت دور اور مخالف سمت سے ملا تھا۔ ناصر کا دل زیادہ تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ پولیس اس کے پاس تو نہ آئی مگر محلے میں ڈیرا ڈال رکھا تھا۔

کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی اکیلی نہیں جاتی۔نعیم نے فیصلہ کیا کہ اپنے ہی ہم رتبہ سے رشتہ داری کرنا چاہیے۔لہٰذا اس نے سردار کے بیٹے کا رشتہ قبول کرلیا۔حالاں کہ وہ ناصر کو زبان دے چکا تھا۔ ناصر کے برعکس سردار چاہتا تھا کہ جھٹ منگنی کردی جائے تاکہ بات پکی ہوجائے۔ناصر آباد کار تھا۔تیسرے درجے کا شہری؛ دلت،شودر۔

ناصر پہ یہ خبر ایک اور قیامت لائی۔ چچا کی ناگہانی موت سے دولت مند بننے کے امکانات محدود ہوچکے تھے۔وہ فل پروفیسر بن کے بھی خالی جیب اور بے اختیار ہی رہتا۔ معاشرے میں عزت و وقار کے لیے جس Nuisance کی ضرورت ہوتی ہے، وہ کسی اُستاد یا پروفیسر کو کبھی حاصل نہ ہوتی۔ناصر دل مسوس کے رہ گیا۔اس نے اپنی والدہ کو بھجوایا جو منہ لٹکائے چلی آئی۔جانے اسے کیا کچھ کہا ہوگا کہ وہ خاموشی سے کرسی پہ ڈھیر ہوگئی۔ناصر کوئی سوال کرنے کی ہمت ہی نہ کرپایا۔

سپنا کے موبائل پہ وہ محتاط میسجنگ کرتا رہا۔سپنا نے اُسے بتلایا کہ وہ والدین کے فیصلوں کے خلاف نہیں جاسکتی اور یوں بھی اپنے ہی استاد سے شادی بالکل نہ جچتی،لوگ بھی طعنے دیا کرتے، ہر محفل میں انھیں تنقید کا نشانہ بننا پڑتا۔

بات بڑھی تو ان کے درمیان تلخی پیدا ہوگئی۔ناصر سپنا کی یادوں اور اس جیپ سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا جو کبھی بھی اس کے لیے وبالِ جان بن سکتی تھی۔ایک روز وہ حوصلہ کرکے زخمی جیپ کی مرمت کروانے لے گیا اور مستری کو تاکید کی کہ جیپ سے ترپال نہ ہٹائے اور چپ چپاتے گولیوں کے نشان ہی غائب کردے۔ٹوٹے ہوئے ونڈ سکرین پر تو کوئی سوال نہ اُٹھاتا۔

مگر اگلے ہی روز اس کا سر گھوم گیا جب پولیس نے گھیر کر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔ پولیس کا مؤقف تھا کہ جیپ کسی واردات میں استعمال ہوئی ہے۔ یونیورسٹی کے طلبا تو مزاحم

ہوئے اور گرفتاری نہ ہونے دی ۔ مگر رات گئے ناصر کو گھر سے اُٹھالیا گیا۔ ناصر کے ستارے گردش میں تھے ۔ ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔

اگلے روز ہی طلبا کو پتہ چلا تو وہ تھانے دوڑے چلے آئے ۔ پولیس نے جذباتی طلبا کو یقین دلایا کہ ان کے پروفیسر سے محض پوچھ گچھ ہو رہی ہے ۔ کسی تھرڈ ڈگری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ طلبا کو نرمی سے سمجھا کر رخصت کیا کہ انصاف ہوگا۔

ناصر سر جھکائے حوالات میں بیٹھا تھا کہ حوالدار نے کسی ملاقاتی کی خبر دی پہلے تو ناصر کو اپنی آنکھوں پہ یقین ہی نہ آیا۔ سلاخوں کے اس جانب سپنا کھڑی تھی ۔ سٹوڈنٹ یونین کے چند لیڈر بھی اس کے ہمراہ تھے ۔ علیک سلیک ہوئی ۔ انھوں نے خیریت دریافت کی ۔ ناصر نے شکایتی نظروں سے سپنا کو دیکھا مگر ماحول کے سبب کچھ بول نہ پایا۔ آنکھوں میں فریاد کیے جارہا تھا۔

لاتعلقی سے سپنا مسکرائی ۔ ”سر ہمت کریں، وقت گزر ہی جائے گا۔“

ناصر پرسکون اور باہمت دکھائی دینے کی کوشش کی ۔ ”آپ لوگوں کا شکریہ ۔ میرا اس قدر ساتھ دے رہے ہیں ۔“

سرگوشی کرنے کے لیے سپنا سلاخوں سے لگ گئی ۔ فضا معطر ہوگئی ۔ ”سر آپ نے ہمیں پڑھایا تھا کہ ایذرا پاؤنڈ امریکی حکومت کے مقدمے سے بچنے کے لیے پاگل پن بیٹھا تھا ۔ پاگلوں کے وارڈ میں رہا۔ مگر ظاہر نہ ہونے دیا۔ جس کے بعد اسے پاگل قرار دے کر آزاد کر دیا گیا ۔ تو وہ بھاگ کر انگلینڈ چلا گیا۔ آپ بھی پاگل بنے رہیں، ہم مقدمہ قائم ہی نہیں ہونے دیں گے ۔“

ناصر حیران رہ گیا ۔ ”یونیورسٹی کا پروفیسر پاگل کیسے ہوسکتا ہے؟ ۔۔۔۔ اچھا ۔۔۔ چلو ٹھیک ہے ۔ مگر ایذرا پاؤنڈ تو بارہ برس پاگل خانے میں رہا تھا ۔“

سپنا نے ہمت بڑھائی ۔ ”آپ فکر نہ کریں ۔ یہ میں بتلا دوں گی کہ کتنے برس پاگل رہنا ہوگا ۔“

شعلہء زباں

بلوچستان پر ون یونٹ کا ابر کھل کر برسا تو ملازمت کے تلاشی جوق در جوق چلے آئے۔ حکومت نے بلوچستان کے لیے نئی آسامیوں اور ترقیاتی منصوبوں کی رپورٹ مانگ تو ڈائریکٹر ایجوکیشن کو جن کا تعلق پشاور کے ہندکو گھرانے سے تھا کہ ہم چوں ما دیگرے نیست۔ اگر نئی آسامیاں آتیں تو وہ کیسے راجہ اِندر بن کے بلوچستان پر براجتے رہیں گے، ہم چوں ما ڈنگرے نیست۔ ان کے مقابل افسر آجائیں گے، ڈائریکٹری ہاتھ سے جائے گی۔ لکھ دیا کہ یہاں نہ تو نئے اسکولوں کی ضرورت ہے، نہ نئی آسامیوں کی اور آخر میں لاحقہ جڑ دیا پس ماندہ جو ہے۔ بابا اپنے بی ایس اے سائیکل پہ دفتر سے لوٹے تو بڑے ہی ناخوش تھے کہ ترقی کے امکانات مارے گئے۔ جیسے ان کے سائیکل پہ تین بندوقوں کا مونوگرام تھا، ویسے ہی حکومتی اداروں کے پاس بھی زبان بندی کا نسخہ تھا کہ اینٹی اسٹیٹ ہے۔ بی ایس اے سائیکل کے اسی مونوگرام سے سبھی ڈرتے سہمے سہمے رہتے۔ بابا بھی خون پیتے رہ گئے۔ احتجاج نہ کیا۔

ون یونٹ کے افسروں میں پروفیسر خلیل صدیقی، پروفیسر سید خلیل، نبوت یار خان، ریاض احمد جیسے علم کے موتی بھی تھے مگر زیادہ تر بھرتی کا مال تھا۔ ہمارے ایک پروفیسر ڈاکٹر جو کہ فارسی میں پی ایچ ڈی تھے، فارسی میں کھانا بھی نہ مانگ سکتے تھے، 'حکایاتِ سعدی'

کی چھوٹی سی نصابی کتاب سو نمبر والی پڑھاتے۔ ایک بار منصور (ازاں بعد پروفیسر منصور احمد ،چیئرمین بورڈ) نے ان کی کتاب چھپالی۔ وہ تین چار روز پڑھا نہ پائے۔ حاضری لگا کر طلبا کو چلتا کرتے کہ طبیعت ناساز ہے۔ طلبا کے بے حد اصرار پر منصور نے کتاب ان کی میز پر چپکے سے رکھ دی تو گاڑی چلی۔ استاد علم کے موتی اگلنے لگے۔

وہی تعلیم کے قاتل ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے پیری مریدی کرنے لگے۔ نئے ڈائریکٹر عطا تو بابا کے بہت ہی قدر دان تھے۔ اکبر خان کی بجائے اکبر جان کہا کرتے۔ نہایت ہی نفیس انسان تھے۔ بہت ہی وجیہہ و شکیل تھے۔ تعلق ون یونٹ قبیلے سے تھا۔ ان کے بچے بھی بہت خوبصورت تھے، بالکل یوریپین لگتے۔ ان کی ایک بیٹی کی شادی بالی وڈ فرنیچر کے مالک سے ہوئی جو ون یونٹ کے افسروں کے ساتھ چر کٹے کا روپ دھار کے چلا، فیروز نام تھا۔ عطا چوں کہ ڈائریکٹر تھے، نادر شاہی حکم زبانی جاری ہوا کہ تمام خریداریاں فرنیچر کی ان کے داماد فیروز سے ہی کی جائیں۔ اکبر جان اکبر جان کی مٹھاس میں بابا نے بھی فیروز کو آرڈر دے دیا۔ جون میں وہ بل لیے چلا آیا کہ رقم کی ادائیگی کر دی جائے۔ جب کہ فرنیچر دیا ہی نہیں تھا۔ یہ سبھی کچھ خلافِ قانون تھا۔ بابا کے انکار پہ عطا نے بلوا بھیجا اور ضمانت دی کہ ان کے داماد کو رقم دے دی جائے گی، فرنیچر کو جانے دیں، عطا خود بھی تو افسر ہیں، لکھ دیں گے، انسپکشن بھی تو انھی کو کرنا ہے، وہ خود ہی سنبھالیں گے۔ بابا کے انکار پہ شکر رنجی پیدا ہوگئی۔ جس کا اظہار عطا نے نہ کیا۔ بابا بھی بے غم ہو رہے۔

عطا نے سالانہ خفیہ رپورٹ اچھی سے لکھ کر بابا کو دکھائی، پھر اُسے تلف کر کے دوسری لکھی جس میں انھیں بالکل ہی نا اہل قرار دے کر ملازمت سے ریٹائرڈ کرنے کا لکھ دیا۔ یہ بھی محض اتفاق ہے کہ اسی برس قانون بدل گیا کہ متعلقہ افسر کو مخالفانہ رپورٹ بھجوائی جائے تا کہ وہ اس کا جواب دے سکے۔ بابا یہ رپورٹ دیکھ کر تلملا اٹھے۔ عطا کے دفتر پہنچے اور غم وغصہ کا اظہار کیا۔ انھیں اپنا بچاؤ تو کرنا تھا۔ دفاع کیا، اصل وجوہات لکھیں۔ پانسہ پلٹتے دیکھا تو

عطا نے بابا کے خلاف الزامات لگاتے ہوئے رپورٹ کی کہ ان وجوہات کی بنا پر چارج شیٹ جاری کی جائے۔ ہمارے گھر پہ عاشورہ اتر آیا۔ ہم تینوں بھائی زیر تعلیم تھے۔ خاندان کے کفیل بابا ہی تھے۔ بے یقینی نے گھیر لیا۔ لاہور میں سیکرٹریٹ ہوا کرتا تھا، وہاں سے چارج شیٹ آ گئی۔ بہت سے الزامات تھے۔ جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ دورہ کرنے، انسپکشن کرنے کی بجائے گھر بیٹھے ٹی اے لیا ہے۔ ان اسکولوں کے نام بھی تھے۔ بابا نے چاچا صادق کی فوکسی اٹھائی، ان اسکولوں میں گئے۔ لاگ بکس اٹھا لائے۔ انھیں رسیدیں دے دیں۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دو ایک انسپیکشنوں کے نیچے عطا کی اپنی معائنہ رپورٹس بھی تھیں۔ جواب در جواب چلتے رہے۔ معلوم ہوا کہ جن افسروں نے فیروز سے تعاون نہیں کیا، ان سبھی کا عطا حشر نشر کر رہا ہے۔ جس کے باعث بھگدڑ مچ گئی تھی۔ آہ و فغاں تھی کیوں کہ حکومت ان دنوں سخت تھی، ایوبی مارشل لا تھا۔ جس افسر کے خلاف شکایت ہوتی، اسے نکال باہر کرتے۔ تین سو تین افسر بغیر کارروائی کے نکال باہر کیے تھے۔ ریاست کا ڈھانچہ بہت مضبوط تھا۔ ریل گاڑیاں وقت پہ جاتیں، دفاتر میں صبح لوگ پہنچ جایا کرتے۔ مارشل لا کسی کا لحاظ نہ کرتا کسی افسر کے خلاف شکایت ہوتی تو فوراً تحقیق شروع ہو جاتی۔ جس کے باعث افسر بھی محتاط رہا کرتے۔ عطا چوں کہ صوبائی سربراہ تھا، اختیارات اسی کے پاس تھے۔ وہ جس کا چاہتا سر اتار دیتا۔ فیروز محکمے کا داماد بھی بن چکا تھا۔

پھر لاہور سے واقعی چارج شیٹ چلی آئی۔ ایک بڑی چارج شیٹ کے باعث ہم پہ سکوت طاری ہو گیا کہ اب کیا ہوگا۔ بابا دفتر سے گھر لوٹتے ہی دفاع تیار کرنے میں لگ جاتے۔ پھر وہ پلندہ اٹھا کر چاچا حسن کے ہاں جاتے جو بہتر ٹائپسٹ تھے۔ مزے کی بات یہ کہ وہ عطا کے دُور کے رشتہ دار بھی تھے۔ مگر بابا کا ساتھ دے رہے تھے۔ کھٹ کھٹ ٹائپ چلتا، پھر غلطیاں نکالتے، درستگی کرتے۔ رات گئے بابا گھر آتے، ہمیں حوصلہ دلاتے۔ شہر سائیں سائیں کرتا۔ ہم تینوں بھائی ہراساں رہتے کہ اب کیا ہوگا۔ دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ چند ماہ اسی میں بیت گئے۔ محکمہ تعلیم کے افسر مارے خوف کے فیروز سے ممکن تعاون کرنے لگے تھے۔ فیروز نے

موڑ بھی خرید لی تھی۔ بڑے ٹھاٹھ باٹھ تھے۔

چند ماہ بعد انکوائری آفیسر لاہور سے آیا، کیوں کہ مغربی پاکستان کا دارالخلافہ تھا۔ ماں نے جانماز پکڑ لی۔ بابا کے پاس نماز کے علاوہ کوئی وسیلہ، کوئی سفارش نہ تھی۔ ہر وقت اللہ ہی سے مدد مانگتے۔ اماں کہتی کہ کوئی بات نہیں نوکری گئی تو کوئی اور کام کرلیں گے، لڑکے بھی چند ہی برسوں میں کمانے کے قابل ہو جائیں گے۔ مگر بابا کو تشویش تھی کہ انسان نوکری چھوڑ دیتا ہے، ریٹائرڈ ہو جاتا ہے مگر ایمان داری، وطن دوستی کو تو قدرت سزا نہ دے۔ میں نے انھیں سجدے میں کہتے سنا کہ 'اے خدا تو دیکھ رہا ہے، اے خدا رحم کر، میں بے قصور ہوں، عزت کی زندگی دے، موت بھی عزت ہی کی دینا'۔

عجب ہو کا عالم طاری تھا۔ ہمہ وقت دھڑکا رہتا کہ ہوگا کیا۔ انکوائری اسکاؤٹ ہیڈکوارٹر میں شروع ہوئی تو بیک وقت بابا اور عطا کے خلاف تھی۔ بابا نے جو الزامات لگائے، ان کا دستاویزی ثبوت موجود تھا۔ انکوائری میں بابا بے گناہ قرار پائے۔ بابا کو ڈسٹرکٹ انسپکٹر کوئٹہ لگا دیا۔ عطا کی تنزلی ہوئی، اسے گریڈ کم کر کے دالبندین میں ہیڈ ماسٹر لگا دیا گیا۔ بابا سرخرو ہو کر آئے۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ خیر خیرات ہوئی لیکن ہماری زندگی کے جو برس تباہ ہوئے، اس کا مداوا نہ تھا۔

بہت برس نوکری کر کے بابا ریٹائرڈ ہو گئے اور مزے کی زندگی بسر کرنے لگے۔ جمعہ کے روز ہم تینوں بیٹوں کو لے کر بلال مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتے۔ ہم تینوں بھائی ملازمتوں میں چلے گئے۔ مجھے علم تھا کہ ہر ایک کو اس دنیا سے جانا ہے مگر جانے کیوں مجھے کبھی خیال نہ آیا کہ اس قدر محبت کرنے والا باپ بھی رخصت ہو سکتا ہے۔ میں نے کبھی سپنوں میں بھی نہ سوچا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرا باپ ہمیشہ یوں ہی میری طرف دیکھتا ہنستا مسکراتا دعائیں دیتا، سر پہ ہاتھ پھیرتا ہمیشہ گھر پہ رہے گا۔

میرا بڑا بھائی کرنل تھا اسٹاف کالج میں، جب کہ میں کوئٹہ ڈویژن کا کنٹرولر تھا۔ چھوٹا

بھائی اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا۔ ایک صبح نمازِ فجر کے بعد بابا یوں لیٹے کہ پھر نہ اٹھے۔ بابا نے بتایا تھا کہ اس دنیا سے جاتے ہوئے ہمارے مردوں کو ذرا دیر پہلے پتہ چل جاتا ہے۔ خود انھوں نے اپنے بزرگ کو کسی نادیدہ شخصیت سے ہاتھ ملاتے دیکھا تھا۔ جس کا فوراً ہی ہاتھ گر بھی گیا۔ شاید انھیں علم ہو گیا تھا بالکل ہی سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ ہاتھ پاؤں بھی باہم جڑے ہوئے تھے۔

زندگی بہت اداس ہو گئی۔ من میں تنہائی اتر آئی۔ یوں لگا جیسے میں دشت جلب کنڈان میں پابرہنہ چل رہا ہوں۔ سر پہ ہاتھ رکھ کر دعائیں دینے والا چلا گیا تھا۔ لوگوں کے تو ماں باپ ہوتے ہیں، میرا تو صرف باپ ہی تھا۔ عطا اس سے کہیں پہلے دنیا سے منہ موڑ چکا تھا۔

بہت سال گزرے۔ عطا کا بیٹا بیمار پڑا، کراچی گیا تو معائنہ کرایا۔ اپنے ٹیسٹ بھی کروائے۔ خود ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ پھر اپنے ہی ٹیسٹ لے کر ایک اسپیشلسٹ کے پاس گیا کہ یہ میرے دوست کے ٹیسٹ ہیں۔ ڈاکٹروں نے دوائیاں تو دی ہیں، آپ بتلائیں۔ اسپیشلسٹ جانے کس موڈ میں تھا، بولا کہ اس کا علاج ہی دریافت نہیں ہوا مگر ڈاکٹر آخر تک مقابلہ کرتے ہیں، چند ہی ماہ میں سر جائے گا، ان دوائیوں سے تکلیف کم ہو جائے گی، ورنہ مایوس تو تڑپ تڑپ کے مرتا۔ میڈیکل سائنس نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ وہ اس قدر مایوس ہوا کہ ہوٹل میں آ کر نیند کی گولیاں بھاری مقدار میں پھانک لیں۔ اثر بڑھا تو پانی کے ٹب میں لیٹ کر پانی کھول دیا۔

ہمارے تعلقات تو کب کے ختم ہو چکے۔ تاہم فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔ چھوٹا بیٹا یونس بینک کا منیجر تھا۔ وہ ایک حسین آپریٹر سے محبت کرتا تھا، جسے ہم ہیما مالنی کہا کرتے۔ بے حد دلکش تھی۔ یونس کے علاوہ کسی کو نظر بھر کے نہ دیکھتی۔ وہ دونوں تھائی لینڈ اور دیگر ستے ملکوں میں سیر کرنے جایا کرتے۔ پھر شادی بھی کر لی۔ ہیما مالنی تو یوں لگتا کہ وسط ایشیا کے کسی ملک کی شہزادی ہے۔ یونس کی قسمت پہ رشک کرتے، ہم آہیں بھی بھرا کرتے۔ یونس نے بہت دن جانے کیسے ٹرانسفر روکے رکھی۔ جب ٹرانسفر ہوا تو پتہ چلا کہ ڈبل اکاؤنٹنگ کر رہا ہے۔ اسے معطل

کردیا گیا اور انکوائری شروع ہوگئی۔ زیادہ روپیہ انھوں نے سیر وتفریح پہ لگا دیا تھا۔ مجبوراً شالدرہ کی گلیوں میں چھوٹا سا گھر کرائے پہ لیا۔ ہیما مالنی نے ایک اسکول میں معلّمہ کی ملازمت اختیار کرلی۔ پیدل ہی آتی جاتی۔ ایک بار دیکھا، چلچلاتی دھوپ میں چادر اوڑھے گھر لوٹ رہی ہے تو جی چاہا کہ سرکاری جیپ اُسے دے کر خود پیدل گھر کی راہ لوں۔

چند ماہ بعد کیس کا فیصلہ ہونے کو آیا۔ یونس نے ذرائع استعمال کیے تو معلوم ہوا کہ ہر فراڈ میں الگ الگ سزا ہوگی۔ مجموعی سزا شاید نوے برس بنے گی۔ وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ نیند کی گولیاں پھانک لیں۔ وکیل نے عدالت کو بتایا کہ گزشتہ رات یونس زندگی کی قید سے ہی آزاد ہوگیا ہے۔ ملزم کے مرنے سے مقدمہ ختم ہو جاتا ہے۔

بہت سال بیتے تو میں محکمے کا صوبائی سربراہ لگ گیا۔ میرا بھائی بطور بریگیڈیر نیشنل ڈیفنس کالج میں ڈی ایس تھا اور چھوٹا ڈپٹی ڈائریکٹر محکمہ تعلیم، جہاں بابا کبھی ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہوا کرتے۔ ان کے دور میں قلات کی حدود اسپیز نڈ سے شروع ہو کر گوادر اور حب تک جاتیں۔ پورا اخاران، مکران، لاس بیلہ بھی شامل تھا۔

انسانی دل کی طرح بلوچستان کے ڈسٹرکٹ بھی چھوٹے ہوتے چلے گئے۔ جیسے بچپن میں کھانا پورا کرنے کو ماں گوشت کی بوٹیاں اور بھی چھوٹی کر دیتی۔ صوبائی سربراہ کے لیے لازم ہے کہ ناشتے پر یا دفتر پہنچتے ہی اخبار پڑھے کہ اس کے محکمے کے کسی دفتر افسر یا ملازم کے خلاف کوئی خبر تو نہیں چھپی۔ جنرل ضیا اس معاملے میں بہت سخت تھا۔ دفتر میں ایک سیل قائم کر رکھا تھا۔ وہ سیل ملک بھر کے اخباروں کی چھان پھٹک کرتا۔ کسی افسر یا دفتر کے خلاف کوئی خبر چھپتی تو سیل فوراً جواب طلب کرتا۔ وفاقی سیکرٹریوں کو بخار چڑھ جاتا۔ ہم بھلا کس کھاتے میں۔ علاوہ ازیں جنرل ضیا نے وفاقی محتسب کا ادارہ قائم کر دیا تا کہ عام انسان کو فوراً ہی انصاف ملے۔ وفاقی محتسب کا جواب بھی اٹھارہ گریڈ کے افسر ہی بھجوا سکتے، وہ بھی ہفتہ بھر میں۔ ورنہ صوبائی سربراہ بلوا لیتا۔ ساتھ ہی ساتھ تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ یونین کے عہدے دار

ہمارے خلاف بیانات دیا کرتے۔ جو اخبار من وعن شائع کر دیتے۔ ایڈیٹروں سے کہتے کہ کیا مغلظات شائع کی ہیں۔ تو وہ مسکرا کر جواب دیتے کہ محکمے کا بیان بھی من وعن شائع کر دیں گے۔ مجھے بروری ندی کے کنارے ہونے والی کتوں اور ریچھ کی لڑائیاں یاد آجاتیں۔ جنھیں شائقین شرط باندھ کر دیکھتے۔ اب میں اس لڑائی میں کیسے شامل ہوتا۔

ایسی بیان بازیاں محکمے لیے نقصان دہ ہوا کرتیں اور افسر کو متنازع بلکہ بدنام ہی کر دیتیں۔ ایسی بیان بازیاں سرکاری اداروں کے لیے مضر ہوا کرتی ہیں۔ صبح اخبار پڑھنا ایک تکلیف دہ فرض تھا۔ بعض اوقات دماغ ہی سلگنے لگتا۔ یونین سے کہتا کہ بھائی شیخ چلی جس ٹہنی پہ بیٹھا تھا، اسے ہی کاٹے جا رہا تھا، اپنے ہی محکمے کو بدنام کیسے جاتے ہو۔ ایک ادائے بے نیازی سے کہتے کہ یہی تو یونین کا فرض ہے، بیان بازی کے سوا ہمارے پاس کون سی طاقت ہے۔ کچھ نہ بھی ہوا، بدنام تو ہو جاؤ گے۔

ایک روز اندر کے صفحے پر اشتہار تھا، بالی وڈ فرنیچر کے فیروز کی جانب سے کہ اس نے عطا کی بیٹی کو بدچلنی کے باعث طلاق دے دی ہے۔ ایک برق سی کوند گئی۔ میری نگاہوں میں عطا کا پروقار حسین چہرہ گھوم گیا جو فیروز کے ہاتھوں کیسے روپ بدلنے پہ مجبور ہوا۔

ایک مرحوم افسر کو بدنام کرنے کا کیا جواز تھا جس کے باعث فیروز امیر ہو گیا تھا۔ جس کے باعث عطا کا اکبر جان اس کی نظروں میں معتوب ٹھہرا۔ میری نظریں اخبار پہ جم کے رہ گئیں کہ ڈپٹی چلا آیا۔ میں اُس کے سلام کا جواب بھی نہ دے پایا۔ اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ کچھ الجھا سا گیا تھا۔ "پھر کوئی خبر محکمے کے خلاف آئی ہے؟"

میں نے ایک طویل سانس لی۔ "نہیں! یہ ایک عالمگیر سچائی کا اعتراف ہے، ایک تصدیق نامہ چھپا ہے؛ سانکھیہ یوگ، کرم یوگ، مکافاتِ عمل۔"

اس نے اخبار دیکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اخبار دراز میں ڈال کر دراز بند کر دی۔

"ہم آسمانی باتیں کیوں نہیں مانتے! کرم سے دھرم خراب کر لیتے ہیں۔ ان رشتوں کے لیے، جو تارِ عنکبوت میں مایا جال ہیں۔"

اسی سہ پہر میں چھاؤنی میں بابا کی قبر پہ گیا۔ فضا میں زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ تکتور اور چلتن پہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ سردی کے باعث خود رو پودے سوکھ کر پیلے پڑ گئے تھے۔ میں نے سرد سنگ مرمر پہ ماتھا ٹکا دیا۔ وہ دن ٹائپ کی کھٹ کھٹ، فائلوں کے پلندے، دفاعی بیانات کے مسودے، ماں کا غمناک چہرہ، بابا کی متوحش نظریں، بھائیوں کا ہراس گھر کی اداسی زندگی کی بے یقینی ذہن سے گزر گئی۔

میں نے اخبار کا تراشا اوپر رکھ دیا۔ ایک دو کنکریاں اس کے اوپر رکھ دیں اور فاتحہ پڑھ کر لوٹ پڑا۔ نکلتے ہوئے دیکھا، تصدیق نامہ یوں تو اپنی جگہ پیوست سا تھا مگر سرد ہوا کے جھونکوں کے باعث پھڑ پھڑائے جا رہا تھا۔ کسی اجنبی، اَن دیکھی، اَن جانی زبان میں سچائی پکارے جا رہا تھا۔

"انھیں آگ کے شعلہ کی سی پھٹتی ہوئی زبانیں دکھائی دیں اور ان میں سے ہر ایک پر آن پھڑیں۔ اور وہ غیر زبانیں بولنے لگے جس طرح روح نے ان کو بولنے کی طاقت بخشی۔"

عوضی

"وہ آفتاب اوڑھے ہوئے تھی چاند اس کے پاؤں کے نیچے تھے۔ بارہ ستاروں کا جو بن اسی کے چہرے پر تھا۔"

حسن کی عظمت کا تاج سر پہ سجائے نیلے لباس میں بجلیاں گراتی چلی آئی۔ بلا اجازت سامنے کینڈی ڈیٹ کی کرسی پہ آن بیٹھی۔ عمران کو مسکرا کر دیکھا جس سے زور کی بجلی۔ چمکی عمران کے ہوش وحواس جاتے رہے۔ اس نے خود کو سنبھالا۔

"آپ کا نام؟" اس نے افسری اوڑھ لی۔

"میرا نام مسکان ہے۔" وہ تباہ کرنے پہ تلی ہوئی تھی۔

عمران گرتے گرتے بچا۔

ڈوبتے نے تنکے کا سہارا لیا۔ "والد کا نام؟"

مسکان ہوش وخرد کا جلتا ہوا خرمن دیکھ دیکھ دیکھی محظوظ ہو رہی تھی۔ "آپ کے سامنے جو میری سی وی پہلے سے رکھی ہے، اس میں سبھی کچھ لکھا ہے۔"

عمران نے دیکھا کہ سی وی تو پہلے پڑی تھی۔ کچھ دیر کاغذ کو دیکھنے کے بہانے اس نے خود کو سنبھالا۔ "شادی ہوئی؟"

مسکان نے لاپرواہی سے کندھے جھٹکے۔"جی نہیں۔"
عمران اب مسکرا رہا تھا۔"کیا وجہ ہے؟"
مسکان نے لاپرواہی سے ٹال دیا۔"کوئی پسند کا ملے تو بات ہے۔میرا بھی ایک معیار ہے۔محض ہم قبیلہ یا رشتہ دار ہونا تو کافی نہیں ہوا کرتا۔"
عمران بھی عملی انسان تھا۔"ایک حسین عورت کو سنبھالنے کے لیے وسائل بھی ضروری ہیں۔قبائل میں بھی معاشی کلاسیں ہی چل رہی ہیں؛ غریب، متوسط طبقہ، اعلیٰ متوسط طبقہ، امیرا اور روسا، اسی بھگدڑ میں سبھی کچھ کچلا جا رہا ہے۔"
مسکان نے اقرار کیا۔"جی ہاں، اب کوئی بزرگ ولی اللہ علما آئے تو لوگ اس سے کلاس بدلنے کی درخواست کریں گے، عقیدوں کی بجائے لوگ اپنی کلاس ہی پہ توجہ دیتے ہیں۔ کس کار میں آیا، کس جگہ رہتا ہے؟ یہ زیادہ اہم ہے۔کیسا ہے، کیا ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"
عمران کو بہت خوشی ہوئی۔جس کا اس نے اظہار بھی کر دیا۔"آپ کا یہی پتہ ہے؟" اس نے دوبارہ تصدیق چاہی۔
عمران دراصل خود انٹرویو لینا چاہتا تھا کیوں کہ بلوچستان میں عجیب چلن تھا۔ امتحان کسی کو دینا ہوتا، امتحان کوئی اور دے آیا۔ملازم کوئی ہوتا ہے، کام اس کی جگہ کوئی اور ہی کرتا ہے۔افسر پوچھتا کہ اصل ملازم کہاں ہے، تو عوضی آنکھیں دکھاتا۔"آم کھانے سے غرض ہے کہ پیڑ گننے سے، میں جو کام کر رہا ہوں۔" بے شمار ملازمین دیگر شہروں بلکہ ملکوں میں کام کر رہے تھے۔عوضی کو سرکاری دفاتر میں قبولِ عام نے گویا مستند بنا رکھا تھا۔جب کہ عمران جیسے افسر یہ بدعادت ختم کرنا چاہتے تھے۔انھوں نے جیلوں سے۔بہت سے عوضی قیدی بھی پکڑے جو کسی اور کی جگہ سزا بھگت رہے تھے۔محض نفری پوری کرنے کی خاطر جیل حکام بھی انھیں سایہ عاطفت میں لیے بیٹھے تھے۔اسی سبب عمران انٹرویو خود ہی لیا کرتا۔تاکہ کوئی عوضی انٹرویو دے کر کسی اور کے لیے ملازمت نہ حاصل کر سکے۔

اس کا دل تو چاہتا تھا کہ مسکان کو سامنے ہی بٹھائے رکھے اور اس مصور کی تعریف کرتا رہے جس نے ایسی صورت کی مورت بنائی تھی ۔مگر دیگر کینڈی ڈیٹ بلکہ اس کا اسٹاف بھی باتیں بناتا ۔لیکن دل بھلا ایسی تاویلیں کہاں مانتا ہے! مسکان کو سامنے بٹھائے رکھنے کی جی چاہتا تھا۔

عمران کے والدین تو چاہتے تھے کہ کسی سیاسی یا مذہبی گھرانے میں شادی کریں ۔ سیاسی تو اِدھر اُدھر ہوتے رہتے ہیں، جب کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کے قائدین لوٹے سر چوٹی کی مانند سر بلند کیے آسمانوں سے باتیں کرتے ہیں ۔ان کے پاس جاں نثار ہوا کرتے ہیں ۔ اسٹریٹ پاور بھی ہوا کرتی ہے ۔جب بھی چاہیں ملین مارچ کرا دیں ۔سرکاری افسر تو وہ چوزہ ہے جسے اسپیشل برانچ، ایف آئی اے، آئی ٹی بی یا نیب جب چاہے، اچک کر لے جائے ۔جس کا کھوٹا نہ ہو وہ تو نیب کی ایک دوستی بھی برداشت نہیں کر سکتا ۔اخبارات کا الگ دربار سجتا ہے ۔ جسے چاہیں تماشا بنا دیں ۔لیکن عمران کسی خوبصورت سی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا ۔وہ طویل ملازمت کے خیال میں نہ تھا ۔سبھی اعلیٰ افسر ریٹائرڈ ہو کر یورپ میں جزیرے خرید لیتے ہیں ۔ کینڈا، آسٹریلیا، امریکہ اور جانے کہاں کہاں ۔ یہ ملک تو ایک خر کار کیمپ ہے ۔جہاں غریب غربا' امیروں کو پالتے ہیں ۔غیر سرکاری قرضوں سے جزیرے محلات تو وہ خریدیں اور قرض یہ چکاتے پھریں ۔عمران چاہتا تھا کہ چند برس کمانے کے بعد وہ زیادہ حرص نہ کرے بلکہ ملک چھوڑ کر کہیں باہر آباد ہو جائے ۔کیوں کہ ریٹائرڈ ہو کر بڑھاپے میں تو کسی بھی شئے کا لطف نہیں آتا ۔مزہ تو اپنی اپنی جوانی میں ہے ۔نظر کی عینک لگا کر اسپورٹس کار چلائی یا اوبیا گرانگل کر پری شان گئے بھی تو کیا!

عمران کا بھائی خاصا کما کر آسٹریلیا جا آباد ہوا تھا ۔والدین اسی کے پاس تھے ۔ انھوں نے دوبارہ وطن آنے سے ہی بہت معذرت چاہی ۔ بم دھماکے، خود کش حملے، اغوا برائے تاوان ۔۔۔وہ خاصے خوف زدہ تھے واپس آنے سے،"موت سے میں نہیں ڈرتا، مگر یہ

کیا کہ کوئی پنڈلی اٹھائے چلا آئے اور تم بوٹ سے ہی پہچانو کہ میرا والد ہے، کوئی ڈھنگ کی موت ہو۔ بطور مسلمان میں موت سے نہیں ڈرتا۔ ایمان کی دولت جو ہے۔"

عمران کے لیے تو ڈی سی کا سیکریٹ فنڈ ہی کافی تھا۔ مالی سال کے آخر میں ڈپٹی کمشنر ایک تصدیق نامہ جاری کرتا دو سطروں کا، کہ سیکریٹ فنڈ مناسب طریقے سے خرچ ہوا ہے۔ اس پہ دستخط کر مہر لگوا داخل دفتر کرتا۔ کمبخت بلوچستان کو ڈبل روٹی کی مانند کاٹے جا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے تینتیس ڈسٹرکٹ بنا ڈالے کیوں کہ ہر سردار میر معتبر چاہتا ہے کہ اس کے ما تحت ایک ڈپٹی کمشنر اور ایس ایس پی ہو۔ سرکار اپنا بجرا لیے مزید ڈسٹرکٹ بنانے پر ہمدردی سے غور کر رہی تھی۔ عمران کو خود پہ غصہ بھی آتا کہ ایک لڑکی جو لیڈی ٹیچر کے لیے انٹرویو دینے آئی تھی، کیسے مارتے کاٹتے اس کے دل کے ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر میں آن بیٹھی۔

اس نے بے خیالی میں پانی کا گلاس بھی اٹھانا چاہا تھا۔ مگر آدھے راستے سے ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ جس سے مسکان بہت ہی محظوظ ہوئی کیوں کہ اس نے ڈی سی کو افسری کے گدھے سے گرتے اور خود ہی سائل بنتے دیکھا تھا۔ اس نے تو جاتے ہوئے بھی مڑ کر دل چھید ہی ڈالا تھا۔ عمران نے جلدی جلدی انٹرویوز نپٹائے۔ اس نے ٹیچر کے انٹرویو میں جیون ساتھی کا انتخاب کر لیا تھا۔ اب کچھ کمانے کا ٹارگٹ ہی بچا تھا۔ اس کا بھائی جب کچھ جرمانے نذرانے دے کر جیل سے آزاد ہوا تھا تو نیب ہی کے نیک دل افسر نے کہا تھا کہ ملک سے چلتا بنے کہ حکومت تبدیل ہونے سے پرانے فیصلہ شدہ مقدمات بھی دوبارہ ہی کھل جاتے ہیں۔ کیوں کہ فصل تو کم ہے مگر کاٹنے والے زیادہ ہیں، جس کے باعث پرانے گنے کا پھوک ڈال دیتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ تو نکلے گا ہی۔

یہاں عوضی کا موسم تھا۔ ہر کوئی عوضی تھا۔ وزیر اعلیٰ سے لے کر وزیر مشیر تک سبھی عوضی تھے۔ بوٹ کا لشکارا پڑتے ہی سر بہ سجود ہو جاتے، محمود و ایاز، سبھی کا سلسلہ جاری و ساری تھا۔ ٹارگیٹ کلنگز کا موسم آیا تو عمرو عیار کی زنبیل لیے ایک قاتل آیا جس نے جادو کی ٹوپی اوڑھ رکھی

تھی ۔ وہ سر عام قتل کر کے کسی 'نامعلوم مقام' سے فون کرتا کہ وہی قاتل ہے ۔ سیٹلائٹ موبائل حاصل کرنے کے لیے شناختی کارڈ، انکم ٹیکس نمبر دینا ہوتا ہے، مکمل پتہ اور بینک جہاں کہ ماہانہ بل آتا ہے ۔ سات عدد سیٹلائٹ یا کم از کم چار سے وہ وابستہ رہتا ہے ۔ مگر بلوچستانی قاتل کو تلاش نہ کیا جاسکا ۔ شاید وہ شیو بھگوان کے قدموں میں ہمالیہ کی بلندیوں پہ رہتا تھا، جہاں شیو کی جٹاؤں سے دریائے گنگا نکلتا ہے ۔ ہزار ہا خاندان جان بچانے کو تیسری ہجرت پر مجبور ہوگئے ۔ پہلی بار وہ بھارت سے آئے تھے ۔ آزادی کی دُھن میں مست ۔ پھر 1972ء میں جب پہلی صوبائی حکومت بنی تھی ۔ اور 2006ء کے بعد جب کہ نامعلوم مقام سے خون کرنے والا قاتل دندناتا پھر رہا تھا ۔ ہزارہ قوم کے محلّے اجڑ گئے ۔ گھر گھر سوگ تھا ۔ جنازوں کے ہمراہ وسرخ جھنڈے لہراتے ہوئے چلتے جو کہ ایک قدیم رسم تھی کہ یہ خونِ ناحق ہے، جس کا حساب انھیں لینا ہے ۔ کوئی تین ہزار کے قریب تو ربڑ کی کشتیوں میں سرکش سمندر پار کرتے ڈوب گئے ۔ یورپ کے سرد برفانی پہاڑوں میں غیر قانونی تارکین وطن کی حیثیت سے چھپتے چھپاتے شہروں کا کھوج لگاتے ہزاروں افراد بھوک اور سردی سے مارے گئے ۔ آبادکاروں کی جائیدادوں پہ قبضے ہوتے چلے گئے ۔ وہ ہزارہ قوم کی طرح جفاکش تو نہ تھے کہ سمندروں برفانی پہاڑوں سے راہ بناتے ۔ وہ دیگر صوبوں میں ہی مہاجرین بن کر چلے گئے ۔

عمران بھی چاہتا تھا کہ زندگی کی کمائی کر کے نکل جائے ۔ کیوں کہ بلوچستان ایک مزار ہے ۔ ڈوبتے ہوئے بحری جہاز میں بھلا کون رہتا ہے ۔ سوائے بھوکے پیاسے بے آسرا عوام کے کون ان صحراؤں میں جیون بتانے کا حوصلہ رکھتا ۔ پولیس کی بھی حالت نازک تھی ۔ چھ ہی برس میں سو سے زیادہ حملے ہوئے ۔ ایک دہائی کے دوران دو ڈی آئی جیز، دو ایس ایس پی، ایک ایس پی، اُنیس ڈی ایس پیز، تیئس انسپکٹرز، پچھتر سب انسپکٹر، چوون اے ایس آئی، ایک سو پینسٹھ ہیڈ کانسٹیبلز، پانچ سو ستاون کانسٹیبلز اور کلاس فور کے بہتر پولیس ملازمین شہید ہوئے ۔ انفرادی حملوں میں شہادتوں کی تعداد الگ ہے اور ہزار ہا افراد تو ویسے ہی غائب

کر دیے گئے ۔ یوں لگتا تھا جیسے ایک ساتھ وہائٹ بن قبائل ٹوٹ پڑے ہوں ۔ ہر نظام، ہر چیز کو تباہ کیے جاتے ہوں ۔

عمران کو اپنی آئیڈیل اتفاقاً ہی مل گئی تھی ۔ اسے محاورہ بھی یاد تھا؛ Brave deserve beauty ۔ اسے بھی دلیری سے کام لینا تھا ۔ بجائے کسی مضبوط خاندان میں شادی کرنے کے، وہ مسکان کو لانے کے لیے تیار ہو گیا ۔ طاقت تو دولت کے عقب میں ہاتھ باندھے چلی آتی ہے ۔ شراب کی طرح طاقت بھی روپے سے خریدی جا سکتی ہے ۔ رہی افسری تو یہ آدھی رات کا بستر ہے ۔ بیوروکریسی کی جس طرح کمر توڑی گئی، وہ جانتا تھا ۔ اس نے چیف سیکرٹری کو بریف کیس لیے کراچی بھاگتے دیکھا تھا، اور نیب کی حراست میں پینٹ کوٹ ٹائی میں زمین پہ بدحواس بیٹھے بھی دیکھا تھا ۔ اسے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہ دی گئی ۔

عمران نے دوستوں سے بات کی ۔ ان کے گھر کی خواتین خوشی خوشی رشتہ مانگنے گئیں ۔ حسبِ توقع ان کی پذیرائی ہوئی تو مرد اُن کے ہاں گئے ۔ رشتہ منظور ہوا ۔ ولور کی رقم پر کچھ کھینچا تانی ہوئی ۔ وہ بھی عمران نے قبول کر لیا ۔ شادی دھوم دھام سے ہوئی ۔ عمران کا بھی عقیدہ تھا کہ غریب غربا خدا کی ناپسندیدہ مخلوق ہے ۔ اس نے قریبی عزیزوں کو نظر انداز کر کے نوابوں، سرداروں اور اعلیٰ افسروں ہی مدعو کیا ۔ تاکہ رعب داب بھی رہے ۔

عمران نے مسکان کا گھونگھٹ اٹھایا تو مایوسی کا خودکش حملہ ہوا ۔ عام سی شکل وصورت کی ایک قبول صورت لڑکی میک اپ میں ڈوبی ہوئی بیٹھی تھی ۔ جیسے آئل پینٹ کرتے ہوئے مصور نے تصویر ہی رنگوں میں لتھیڑ کر رکھ دی ہو ۔

وہ چیخ ہی اٹھا ۔"تم کون ہو؟"

دلہن سہم کر ہی رہ گئی ۔"میں مسکان ہوں ۔"

کچھ دیر تو مسکان ڈری سہمی جواب دیتی رہی مگر جب عمران گرجا کہ میں تمھیں طلاق دیتا ہوں تو اچانک ہی خرگوش سے چیتا بن گئی اور لڑنے مرنے پہ آ گئی ۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا ۔ وہ

لڑنے مرنے پہ تیار ہوگئی۔ دونوں نے موبائل سنبھالے۔ عمران کے دوست فیملی سمیت چلے آئے اور مسکان کا باپ یہ مسئلہ نمٹا کر چلا آیا۔ مگر وہ مشتعل نہیں تھا۔ اسلحہ بردار مردوں کے ساتھ آرام سے آن بیٹھا۔

''قبائلی لوگ عزت کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔ اگر میری بیٹی پر کوئی الزام ہے تو ثبوت پیش کریں۔ شادی کے ایک گھنٹہ بعد طلاق میری بیٹی پر سنگین الزام ہے، ہماری بے عزتی ہے۔''

مسکان کا باپ عمر بدستور غیر مشتعل تھا۔ ''قبائل دستور میں عزت کی قیمت روپیہ نہیں جان ہے، زندگی ہے۔ تم طلاق دو، ابھی میں اسی وقت تمھیں گولی ماردوں گا۔ جس کو بلانا ہے بلالو۔''

عمر نے بیٹے سے ایم ون رائفل لے کر کاک کرلی۔ وہ آپ سے تم پہ اتر آیا تھا۔

عمران کے دوست بیچ بچاؤ کرانے لگے۔ افہام وتفہیم کی راہ تلاش کی گئی۔ موت عمران کے سر پہ منڈلا رہی تھی۔ ایک آبادکار قبائلی سماج میں مچھر سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ بہت دیر بعد یہ فیصلہ ہوا کہ مسکان سے نکاح برقرار رہے گا۔

لوگ چلتے بنے تو وہ دوبارہ حجلہ عروسی میں آیا۔

''سچ، سچ بتادو تم کون ہو؟'' عمران کو پسپا ہوتے دیکھ کر وہ شیر ہوگئی تھی۔

''میرا نام مسکان ہے۔ شناختی کارڈ بھی دکھا سکتی ہوں۔ آپ نے میری بے عزتی ہے۔ کمرے سے باہر چلے جائیں۔'' بڑی ہی دبنگ بیوی تھی۔ گلے پڑا ڈھول اسے عمر بجانا تھا۔ مسکان کے اندر کسی مرحوم جرنیل کی روح بول رہی تھی۔

''اگر تم مسکان ہو تو وہ کون تھی جو انٹرویو کے لیے آئی تھی؟''

مسکان نے قہر بھری نظر ڈال کر منہ موڑ لیا۔

عمران بے حد پریشان سا رہنے لگا۔

ایک روز اس کے ذہن میں بجلی سے چمکی ۔جس عوضی کا وہ دشمن تھا، جس عوضی نظام کو ختم کرنے کے لیے خود انٹرویو لینے بیٹھا تھا، وہ لڑکی مسکان کی عوضی تھی ۔اس نے بہت سے عوضی ملازمت سے نکالنے تھے ۔بہت سے ملازم عوضی کی بجائے خود ڈیوٹی پہ آنے لگے تھے ۔
مگر اسے عوضی کی تلاش ہوئی، اسے وہ آئیڈیل تلاش کرنا تھی ۔کسی بھی صورت کسی بھی قیمت پر، عزتِ نفس کا خیال تھا ۔جس کے باعث وہ چاہتا تھا کہ پوشیدہ طور پہ پتہ چلائے ۔ورنہ صحافی تو خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں ۔ماتحت بھی کھوکھلی خوشامدیں کرتے ہیں، موقع پاتے ہی پشت میں خنجر گھونپ دیتے ہیں ۔

اس نے ایک تجربہ کار پولیس افسر کو بلایا جو مشکل ترین کیس حل کرنے کی شہرت رکھتا تھا ۔اسے اعتماد میں لیا تو وہ اگلے ہی روز چاچا کھوجی کو لے آیا ۔یہ ایک پستہ قد انسان تھا ۔چہرہ گرگوت کے بیر کی طرح پچک چکا تھا ۔بظاہر یوں لگتا کہ چند گھڑیوں کا مہمان ہے ۔کھوجی کو عمران نے بھاری انعام کا مژدہ بھی سنایا۔

''میرا بیٹا ایم اے پاس ہے، اسے کلرک یا نائب قاصد لگا دیں، یہی انعام کافی ہوگا'' کھوجی منمنایا۔

عمران نے وعدہ کیا کہ نوکری کے علاوہ انعام بھی دے گا۔

کھوجی نے انٹرویو والے دن کی فوٹیج مانگی جو کہ دفتر نے اسے دے دی ۔

بالکل ہی خفیہ طور ریکارڈ حوالے کیا گیا۔ دو ہی روز کھوجی نے بازیابی کی اجازت چاہی۔

اس نے لفافہ ادب سے میز پر رکھ دیا۔

عمران نے بے تابی سے لفافہ کھولا تو اس میں سے اصلی مسکان کی تصویر نکلی ۔جسے دیکھتے ہی عمران اچھل پڑا اور بے تاب ہوگیا۔

''یہ ہے اصلی مسکان۔''

کھوجی نے انکار میں ہاتھ ہلایا۔''جی نہیں، یہ اصلی مسکان کی عوضی ہے ۔مسکان نے

اسے اپنی جگہ انٹرویو پہ بھیجا۔ خواتین کی تصویریں پردے کہ وجہ سے مانگی نہیں جاتیں۔ جس کے باعث کسی نے اعتراض نہ کیا۔"

"تمہارے بیٹے کا نام کیا ہے؟" عمران نے خوش ہو کر دریافت کیا اور چند ہی لمحوں میں بیٹے کی نوکری کا پروانہ کھوجی کے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔

کھوجی پر شادی مرگ طاری ہوگئی۔ "یہ احسان میں کبھی نہ بھولوں گا۔"

ایسے لفظ عمران پہ رائیگاں ہی جایا کرتے۔ وہ جانتا تھا کہ بروٹس کے علاوہ بھی بے شمار محسن کش گزرے ہیں۔ جس کے باعث تنبیہ کی گئی ہے کہ جس پہ احسان کرو تو خدا سے دعا بھی مانگتے رہو کہ اس کے شر سے محفوظ رکھے۔

کھوجی دو ایک روز میں دوبارہ چلا آیا۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔

"یہ لڑکی میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے، وحید خان کی بیٹی ہے۔ یہ اس کا موبائل نمبر ہے۔" اس نے کاغذ آگے رکھ دیا۔ "نام بریشا ہے۔"

عمران نے کھوجی کو انعام دے کر رخصت کیا اور زبان بند رکھنے کی بھی تلقین کی۔

مسکان اور عمران مچھ جیل کے اے کلاس قیدیوں کی طرح رہتے تھے۔ ناشتے کھانے پہ ایک میز پر آجاتے۔ ایک ہی چھت تلے الگ کمروں میں رہتے۔ بلاضرورت بات نہ کرتے۔ اس ہنگامے ہی کے سبب لوگوں نے انھیں دعوتوں پہ نہیں بلایا تھا۔ مسکان نے زبان بند ہی رکھی تھی۔ کسی عوضی کے بارے میں کچھ بھی بولنے کو تیار نہ تھی۔

عمران نے بریشا کو تعارف کے ساتھ میسیج دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتا تھا مگر فائدہ ایک ایسی لڑکی نے اٹھایا جسے وہ جانتا تک نہ تھا۔ موبائل سامنے رکھے وہ بہت دیر سکرین پہ نظریں جمائے رہا۔ سکرین چمکی، دوسری جانب بریشا تھا۔ جسے انتہائی افسوس ہوا کہ اس کی سہیلی نے اتنا بڑا افراڈ کیا ہے۔ بریشا کو اس کے حق سے محروم کردیا ہے۔

"اب کیا ہوسکتا ہے؟" بریشا مایوسی سے سوال کیا۔

عمران نے کہا۔ ”مسلمان ہوں، دوسری شادی میرا حق ہے، وہ بھی تم سے، بھلا مجھے کون روک سکتا ہے۔“

عمران نے اس کی پریشانی دور کی۔ ڈی سی کا عہدہ ہی ایسا تھا کہ پہلے ہی ریلے میں بریشا بہہ نکلی۔ سیکریٹ فنڈ کا علم اب ایک دنیا کو تھا۔ افسروں کے وہائٹ کالر کرائم سے بھی دنیا واقف تھی کہ سب کچھ کھا پی جاتے ہیں۔ ثبوت ہی نہیں چھوڑتے۔

قریبی دوستوں نے ساتھ دیا۔ ان کی بیویاں اب بریشا کا رشتہ مانگنے گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں تین یکے تھے۔ عہدے کا سنتے ہی گھرانا شادی کے لیے تیار ہوگیا۔ عمران کو خطرہ تھا کہ طلاق پہ گولی مارنے کے لیے تیار ہونے والے کہیں دوسری شادی پہ ہنگامہ نہ کریں۔ اسے بتایا گیا کہ قبائلیت کا توڑ عقیدوں کی ڈھال ہے۔

عمر نے جب گھر آ کر اسے گھورتے ہوئے سوال کیا کہ آیا وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ تو عمران نے بے دھڑک کہا کہ وہ تو چار شادیاں کر سکتا ہے، یہ تو محض دوسری ہے۔ عمر نے آنکھیں دکھائیں تو عمران برس پڑا۔ ”آپ کون ہوتے ہیں ایک مسلمان کو دوسری شادی سے روکنے والے؟ توہین لگ گئی تو میں بھی نہ بچا پاؤں گا حالاں کہ ڈی سی ہوں۔“ عمر کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں وہ سراسیمہ ہو کر کھسک گیا۔ اس خبر نے مسکان کو بھی دہلا دیا تھا۔ کہاں تو لاتعلق رہتی، اب تو بچھی ہی جاتی۔ اس کے بیڈ روم میں بھی آنے لگی۔ کھانے پینے کا بہترا اہتمام کرتی۔ بھاگتے ڈی سی کی لنگوٹی ہی بھلی۔

وہ مفاہمت پہ اتر آئی تھی۔ ”بریشا کو مجھ سے زیادہ اہمیت تو نہ دیں گے؟“

وہ تذبذب کے عالم میں تھی۔ عمران بخوبی جانتا تھا کہ ٹانگے، مٹکے، چٹائی ریکارڈ پلیئر کی طرح محبت بھی قصہ پارینہ ہوئی۔ کبھی محبت ہوا کرتی تھی، اب تو یہاں بیوی میں بھی ڈپلومیسی ہی ہوا کرتی ہے۔

اس نے اینٹ کا یکہ پھینکا۔ ”بیوی تو تمھی ہو، وہ تمہاری عوضی ہی رہے گی۔“

بھیج کاگ

جرمن عجیب سی نرالی قوم ہے۔ ہر کوئی اپنے کام سے ہی کام رکھتا۔ بریمن میں کلارا ہی آخری سہارا تھی۔ وہ میری قوم سے خائف تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم پیدائشی دہشت گرد اور خود کش حملہ آور ہیں۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ جرمن دنیا کی اعلیٰ ترین قوم ہے۔ وہائٹ کاکیشین ریس کے ناطے وہ بھی کچھ لکڑ ٹائپ کی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پہ تاثرات ہی نہ آتے۔ مسکراتی تو ذرا ہونٹ پھیل جاتے، چہرہ ویسا بھی رہتا۔ شرمانا تو اسے آتا ہی نہ تھا۔

ہم ایک ہی ہاسٹل میں رہتے تھے۔ ویک اینڈ پہ وہ اپنے گھر چلی جایا کرتی۔ اس کا جیون ساتھی ایک کمینہ کتا تھا جو تھا تو کسی بونی نسل سے چھوٹا سا کہ پاؤں رکھ دو تو چیں چاں کیے بغیر ہی جان دے ڈالے۔ مگر کلارا کا سخت لاڈلا تھا۔ اسی کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ ایسا نازک اندام کہ تھک بھی جاتا تو کلارا اسے بانہوں میں بھر لیتی۔ کچھ مسکراتی شرماتی تو بات آگے بڑھتی۔ وہ تو سرد سرد نظروں سے دیکھا کرتی۔ ٹنڈرا کے میدانوں کی سرد ہوائیں میرے دل پہ یلغار کر دیتیں۔ بہت کوشش، صبر اور تحمل سے میں اس آئس برگ کی طرف بڑھتا رہا۔

اب سے گپ شپ بھی ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ چائے کافی بھی ساتھ ساتھ پینے لگے۔ پھر شاپنگ کے لیے بھی اکٹھے ہی نکلتے۔ ایشیائی عورتیں تو لہرا کر جھوم کر چلتی ہیں۔ جیسے ٹرک کا

سینٹرل بلٹ ٹوٹ گیا ہو، دائیں بائیں جھول رہا ہو۔ بیرنگ میں چال ہو، کابلی شاک جواب دے چکا ہو۔ جب کہ جرمن عورتیں سینہ تان کر سیدھا چلتی ہیں۔ جیسے ہٹلر کی فوج پولینڈ پر یلغار کر رہی ہو۔ ہر قدم پر ان کے بال اور ڈھیلے بانٹ اوپر کی جانب اچھل جاتے۔ اگلے قدم پہ فریم پہ آجاتے۔ پھر اوپر بلند ہوتے۔ لیکن جب قدم رکھتے تو ہر چیز معمول کے مطابق اپنے ہی مقام پہ ہوتی۔ کوئی کل پرزہ نہ گرتا۔ اس قدر اچھل پھاند کے بعد بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔

کلارا کا قد بھی میرے برابر ہی تھا۔ ہیل پہن کر تو وہ مجھ سے بھی بلند قامت لگتی۔ مگر پردیس میں تکبّر کیسا۔ بلند قامت ہونے کے باعث وہ میرے برابر بھی چلتی۔ البتہ اس نابکار کو جسے پیار سے سلّی کہتی بانہوں میں بھر لیتی، وہ ایک ٹوائے ڈاگ تھا۔ چھوٹے فٹ بال کی مانند بے ہنگم سا تھا۔ بالوں کی جھالر آنکھوں پہ پڑی رہتی۔ جیسا وہ نازک اندام تھا، کتوں کے نام پہ دھبّہ تھا۔ ایسی ہی نازک سی اس کی زنجیر اور پٹہ تھا۔ جو بس یا سفر کے دوران یا شاپنگ کے اوقات میں پہنا دیا کرتی۔ جرمن مرد بیئر کے ٹمبلر پی جاتے مگر کبھی کسی کا پاؤں اس بونے پر نہ آیا۔ اس کمبخت کا کھانا بھی اس قدر مہنگا تھا کہ روپے سے ضرب دے کر مجھے غش آنے لگا۔ جھالاوان میں ہمارے کئی خاندان اس رقم پر پل سکتے تھے۔

ابتدا میں جب وہ پارک میں واک کے لیے ساتھ نکلتی تو میں بہت خوش ہوتا کہ رام ہو رہی ہے۔ پھر پتہ چلا کہ سلّی کو سیرا کرانے جارہی ہے۔ کسی جگہ کافی پیتے تو میری بجائے وہ سلّی کو دیکھتی۔ ''یہ کچھ پریشان ہو رہا ہے۔ اسے شور اچھا نہیں لگتا۔'' بڑی کوفت ہوتی۔ کبھی دل چاہتا کہ سلّی کی زنجیر اپنے ہی گلے میں ڈال لوں اسے دریا کی لہروں کے حوالے کر دوں۔

مارے حسد کے میں اسے سگ لیلیٰ کہا کرتا۔ یہ نام دوستوں میں بھی مقبول ہوا۔ کسی طرح یہ نام کلارا تک بھی پہنچا۔ مجھ سے مطلب پوچھا تو میں نے ترجمہ پیش کیا کہ محبوب شخصیت کا جان سے پیارا کتا۔ وہ جرمن تلفظ میں سکِ لیلیٰ کہتی تو بہت اچھی لگتی۔ چوں کہ سلّی کا ایک مطلب حقیر بھی بنتا ہے، میری سفارش پر اس نے نام ہی بدل دیا۔ نام بدلنے کے باوجود وہ ویسا ہی

کمینہ رہا۔ میری شفقت بھی اسے خواجہ سگ پرست والا وفادار اور شریف کتا نہ بنا پائی۔

کلارا کا سر خطِ استوا سے کہیں بلند تھا۔ وہ میری محبت کی گرمی محسوس نہ کر سکی۔ کبھی کبھار وہ ویک اینڈ پر جانے کی بجائے ہاسٹل میں ہی رہتی۔ ماں باپ کے ساتھ ویک اینڈ بیمار لڑکیاں ہی گزارتی ہیں۔ مگر وہ شمال کی قدامت پسند لڑکی تھی۔ وہ میرے دین کا بھی احترام کرتی۔ ابتدا میں قطب نما کی مدد سے میں نے نماز کا رُخ متعین کرتے ہوئے کالے مارکر سے کمرے میں ایک تیر بنا دیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اس تیر کا بڑا ہی احترام کرتی ہے۔ اس کے دائیں بائیں سے احتراماً گزرتی ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا تو وہ بولی کہ یہ تمھارے دین کا مقدس نشان ہے، اس کا احترام ضروری ہے۔ میں نے بتلایا کہ ہم خانہ کعبہ کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ تیر تو صرف سمت کا تعین تھا۔ میں نے نشان مٹا دیا۔ وہاں چوں کہ اذان نہیں ہوتی، میں گھڑی سے اوقات طے کرتا۔ وہ ایسے معاملات میں بھی محتاط رہا کرتی۔ ان اوقات میں رابطہ نہ کرتی۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی، قد کچھ چھوٹا ہوتا تو اس سے شادی کے بارے میں سوچا جا سکتا تھا۔ وسط ایشیا کے حملہ آوروں کو موبائل ٹاور جیسی عورتیں جانے کیوں پسند رہیں۔

ہماری شاعری ان ہی کے جلووں سے بھری پڑی ہے۔ وہ شاعری والی سرو قد تھی۔ جس کے باعث مجھے الجھن ہوا کرتی۔ جرمن سرد اور رانجھا یار والا سونی گلیوں کا ملک۔ کوئی لفٹ ہی نہ کراتا۔ بات ہی نہ کرنا چاہتا۔ سبھی اپنی اپنی نرگسیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہندوستان، بنگلہ دیش کے لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوتی۔ ہم سبھی جرمن سماج کے دَلت تھے۔ پاکستانی اکثر کھانے پہ بلایا کرتے۔ ان لمحوں میں احساس ہوتا کہ جیسے اپنے ہی وطن میں بیٹھے ہیں۔ اس قیدِ تنہائی میں کلارا کا وجود ایک غنیمت تھا۔ مال اور ڈگری لے کے جانا تھا، بس خوش خوش ہی رہتے۔

ایک روز دوستوں نے کہا کہ اپنا پہناوا پہن کر نکلیں گے اور چھٹی کا دن کہیں باہر گزاریں گے۔ میں تیار ہوا۔ شلوار قمیض کندھے پہ چادر اور سر پہ سفید چترالی ٹوپی۔ سوچا کہ کلارا کو

بھی اپنا پہناوا دکھاتا چلوں۔ سوچتی ہوگی کہ ان کا لباس کیسا ہے۔

دروازے پہ طبلہ نما تھاپ دی تو وہ اندر سے پکاری،"کون؟" "میں نے نام پکارا' تو بولی چلے آؤ۔ جونھی میں اندر داخل ہوا، سگ لیلیٰ نے مجھ دیکھ کر ایک دل دوز چیخ ماری اور کلارا کی گود سے کود کر سرپٹ اندر بھاگا۔ کلارا ٹھہر گئی، ساکت ہوگئی۔ پھر خفت آمیز لہجے میں بولی،"یہ کیا ہے؟"

میں نے فخر سے سینہ تان لیا۔"یہ میری پہچان ہے، میرے دیس کا لباس۔"

وہ بدستور ہراساں تھیں۔ سگ لیلیٰ اس کی زبان پہ اٹک جاتا، جیسے جرمن بولتے ہوئے مجھے لگتا کہ جبڑا ہی اتر جائے گا۔ وہ محض لیلیٰ کہنے لگی تھی، حالاں کہ وہ اس کا مجنون تھا، سارا وقت چپکا رہتا کمبخت۔

"لیلیٰ تمھیں دیکھ کر ڈر گیا ہے۔ تم نے یہ کیا سوانگ رچایا ہے؟"

مجھے سخت غصہ آیا۔"بھئی یہ تو ہمارا لباس ہے۔"

"اچھا بیٹھو، میں ذرا لیلیٰ کو لے آؤں۔"

وہ بمشکل اسے اٹھا کر لائی، کیوں کہ تھا تو گیند نما مگر بار بار ہاتھوں سے نکلا جاتا۔ مجھے دیکھ کر اس پھر ایک دل دوز چیخ ماری اور چھلانگ مار کے بھاگ نکلا۔ کلارا جھنجھلا گئی۔"اس لباس میں کیوں آئے ہو۔ لیلیٰ تم سے ڈرتا ہے بیچارا!"

میری غیرت قومی جاگ اٹھی۔"تو کیا میں تمھارے کتے کی پسند کا لباس پہنا کروں؟ میں تم سے ملنے آیا ہوں، اس کتے سے؟"

کلارا کی خاموشی سے میں اور بھڑک اٹھا۔ پاؤں پٹختا باہر نکل گیا۔ رات کا کھانا کھانے لوٹا تو ہم وطنوں سے ملنے کی سرشاری تھی۔ اتفاقاً راہداری میں آمنا سامنا ہوگیا۔ میرا خیال تھا کہ کلارا مجھے منائے گی تو ذرا پس و پیش کے بعد اس کی معذرت قبول کرلوں گا۔ لیکن وہ میرے تیور دیکھ کر ذرا بھی نہ پسیجی بلکہ سر کے اشارے سے ہائے کا جواب دیتی گزر گئی۔

رات میں سوچا کہ جرمن لڑکی ہے، اس کا دل بھی جرمن ہوگا، اسے کیا فرق پڑے گا۔
ہم نے بارہا بلوچستان کا علاقہ سرحد کا تعین کے نام پہ ایران کو دے دیا، جرمن تو برلن کے لیے ایک ایک انچ پہ لڑتے رہے۔ ہم سمرقند و بخارا ایک تل پہ قربان کر آئے ہیں۔ یہ برلن کی ایک ایک انچ زمین کے لیے جانوں کے نذرانے دیتے رہے۔ مرد قربان ہو گئے تو دس گیارہ برس کے بچے مشین گنوں کے پیچھے آ کھڑے ہوئے اور حملہ آوروں پہ فائر کھول دیا۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے۔ ان میں وہ ہماری سخاوت اور دریادلی کہاں۔ دوستوں نے بھی مشورہ دیا کہ یہ خود کو برتر سمجھتے ہیں، بہتر ہے کہ مونچھ نیچی کرلو، کورس ختم کر کے چلے جاؤ گے تو کہاں کی کلارا اور کہاں کا سگ لیلیٰ۔

ایک دو روز بعد میں خود ہی مسکرانے لگا۔ لہجہ بدستور درباری بنالیا۔ یوں بات بن گئی۔ ایک اچھے سے ریسٹورینٹ میں کھانا کھلایا۔ کچھ لطیفے سنائے تو بات بن گئی۔ جرمن ہونے کی باوجود اس کا دماغ عورتوں والا ہی تھا۔ تریاہٹ کا وجود اس کے ذہن میں بھی تھا۔ مجھے پسپا ہو کر قدموں میں گرتے دیکھا تو عطوفتِ شاہانہ سے کام لیتے ہوئے کلارا نے دوستانہ رویہ اختیار کرلیا۔ کھانا دوبارہ منظور کیا۔ ورنہ تو اس ہاسٹل کے در و دیوار سے وحشت ٹپکتی۔ کینٹین میں دوپہر کو اکٹھے بھی ہوئے تو ہر کوئی پلیٹ تھام کر میز پر اکیلا ہی جا بیٹھا۔ نہ گپ شپ نہ قہقہے، بس خاموشی سے یوں کھانا کھاتے جیسے کہ کوئی مذہبی فرض ادا کر رہے ہوں۔ جیسے سبھی لکڑ پتھر کے انسان ہوں داستانوں والے۔

ایک بار ڈائریکٹر نے بتلایا کہ ایک نیا ٹکٹ جاری ہو رہا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس کا افتتاح تمہارے ہاتھوں سے ہو۔

مجھے فخر بھی ہوا تعجب بھی۔ ”میں تو اتنا سینئر نہیں ہوں؟“

اس کی مسکراہٹ ایسی تھی کہ جیسے کولواہ یا آواران پہ بدلی کہیں سے چلی آئے۔

”دراصل تمہارا لباس بہت مختلف ہے۔ اسی لباس میں آنا۔ لوگوں کو دلچسپی ہوگی کہ

دور دیس کا بندہ افتتاح کر رہا ہے۔"

میری آنکھوں میں سگ لیلیٰ گھوم گیا۔ مگر ڈائریکٹر کو خفا کرنا بھی مشکل تھا۔ اسی سے تو تعریفیں لکھوانا تھیں۔ یہی سوچا کہ تیار ہو کر اس وقت نکلوں گا جب کلارا جا چکی ہو۔ بہت جلد یا پھر قدر دیر سے۔

میرے پاس تھا بھی ایک ہی جوڑا۔ ایک بار کلارا نے متوحش ہو کر پوچھا بھی تھا کہ تمھارے پاس ایسے کتنے جوڑے ہیں؟ میں نے تسلی دی تھی کہ ایک ہی ہے۔ وہ بھی محض اس لیے کہ کبھی اپنی ثقافت کا ذکر ہو تو پہن کر چلا جاؤں۔ جرمنی کی سردی میں یوں بھی کام نہ آتا۔ پھڑ پھڑانے لگتا، ہوائیں کاٹ ڈالتیں۔

تقریب کے روز میں تیار ہوا۔ چھپ کے دیکھتا رہا۔ جب وہ دفتر چلی گئی تو میں تیار ہو کر اپنے قومی لباس میں باہر نکلا۔ شلوار قمیض کندھوں پہ چادر اور سر پہ ٹوپی پہن کر روانہ ہوا ۔باہر کے شہروں میں سرکاری کام سے جانے کے لیے پول سے کار حاصل کرنا پڑتی جب کہ سبھی بسوں میں دفتر آیا کرتے۔ سرکاری کار مع ڈرائیور اور کار سے نکلتے ہی جو نائب قاصد یا کوئی ماتحت اچک کر بریف کیس پکڑ لیتا، اس کا رواج نہ تھا۔ کام چلتا، خوشامد چمچہ گیری جو ہمارے ہاں ترقی کے لیے اشد ضروری ہیں، وہاں اس کا تصور بھی نہ تھا۔

میں نے دو بسیں بدلیں اور اس دفتر جا پہنچا۔ مہمانِ خصوصی تھا۔ میں نے دستی جھنڈا بھی جیب سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ سبز ہلالی پرچم میری پہچان تھا۔ ٹکٹ کا بلون اپ تھا تین فٹ کے قریب اس نئے ڈاک ٹکٹ کا اجرا تھا۔ ایک جانب میں کھڑا ہوا، دوسری جانب ہالمن، درمیان میں لارڈ میئر آگیا۔ تصویریں بنیں، ویڈیو تیار ہوئے۔ اس کے بعد چائے کا دور چلا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئٹہ کی زنان میں لارڈ میئر مجھے ٹیڑھا ٹیڑھا دیکھ رہا ہے۔ نگاہیں ٹکراتے پہ دائیں بائیں نظریں گھما لیتا۔ ہماری شہرت چوں کہ خودکش حملہ آور کے طور پر چار دانگ پھیل چکی ہے، سو چا کہ ڈرتا ہو گا کہ کہیں مہمانِ خصوصی بموں کی پیٹی باندھ کے نہ چلا آیا ہو۔ مگر اس کی

آنکھوں میں خوف نہ تھا، تجسس تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہالمن سے کچھ سرگوشی کی تو ہالمن چلا آیا۔ اشارے سے تخلیہ کا کہا۔ ہم دونوں ہجوم سے نکل کر ایک جانب آ گئے۔ ڈاک ٹکٹوں کے شوقین عملہ صحافی سبھی کا ملا جلا شور تھا۔

ہالمن ذرا ہچکچایا۔ "اگر برا محسوس نہ کرو تو......"

وہ بتلا نہیں پا رہا تھا۔ میں نے سوچا اب ان کی سیکورٹی میری تلاشی لے گی، جس سے نسوار کی ڈبیہ بھی برآمد ہونے سے رہی۔ "لارڈ میئر جاننا چاہتے کہ جو لباس نیچے پہنا ہے، اسے باندھتے کہاں ہیں؟ گردن میں یا کندھوں سے؟"

مجھے وہ پرانا شعر یاد آ گیا۔ "سنا ہے کہ ان کی کمر ہی نہیں ہے، خدا جانے ناڑا کہاں باندھتے ہیں۔" کاش وہ شاعر لارڈ میئر کی طرح دریافت ہی کر لیتا۔ ہم لارڈ میئر کے پاس گئے۔ میں نے پہلو سے قمیض ہٹا کر دکھایا کہ اس کو شلوار، بروزنِ تلوار کہتے ہیں، رسی سے باندھ لیتے ہیں۔ مگر قندھار یا بعض علاقوں میں زنجیر استعمال کرتے ہیں کہ دشمن چاہتا ہے بے لباسی بے عزتی سے بچنے کے لیے لباس ہی سنبھالتا رہ جائے اور مار مار کے اس بھرکس نکال دیا جائے۔

لارڈ میئر نے اطمینان کا سانس لیا مگر آہ بھی بھری کہ امیریکیوں نے جرمنوں کا اخلاق تباہ کرنے کے لیے انگلش گارڈن بنا دیا ہے۔ جس کے گیٹ کے ساتھ ہی کپڑے جمع کرانے پڑتے ہیں۔ پہناوا اتار کر ہی قدرتی زندگی کی یاد تازہ کرنے وہ پارک میں جاتے ہیں۔ ان کا استدلال ہے کہ لباس ضروری ہوتا تو خالق لباس کے ساتھ ہی پیدا کرتا۔

ٹکٹ کا اجرا کامیاب رہا۔ تقریب کو سبھی نے سراہا۔ جھنڈا میں نے میز پہ سجا دیا تھا۔ انھوں نے میرے وطن کے بارے میں بھی سوالات کیے۔

خوشی خوشی میں واپس لوٹا۔ پہلی بس بدل کے دوسری کے انتظار میں جو بنچوں کے سامنے گیا تو دیکھا کہ کلارا بھی بیٹھی ہے۔

سگِ لیلیٰ اس کے آس پاس نازک سی زنجیر سے بندھا اٹھکھیلیاں کر رہا ہے۔ جونھی

اس کی نظر مجھ پہ پڑی، اس نے دل دوز چیخ ماری اور کود کر کلارا کی گود میں جا چھپا۔ یہی نہیں ، دردناک آوازیں لگانے لگا۔ وہاں کتا کسی کو ستائے تو مالک پہ جرمانہ ہو جاتا ہے۔ نیوسینس ان ملکوں میں قابل تعریف قانون ہے۔

اچانک ایک لمبا چوڑا پولیس والا آدھمکا۔ زنجیر سے بندھا ایک خوف ناک ایشن بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے نرم مگر سرد لہجے میں کہا کہ تمھارا کتا پبلک نیوسینس پیدا کر رہا ہے۔ کلارا جو پہلے ہی بدحواس ہو چکی تھی، شرم سے شگرف ہو گئی۔ میں نے بڑھ کر پولیس والے کو بتایا کہ میں کلارا کے ساتھ ہی کام کرتا ہوں۔ صبح میں نے کتے کو مارا تھا اس لیے ڈر گیا ہے۔

سپاہی نے بدستور سرد لہجے میں کہا" اپنے عوام سے جو سلوک کرتے ہو، ہمارے کتوں سے نہ کرو۔" ایک غضب ناک نگاہ مجھ پہ ڈالی اور چلتا بنا۔

ہم دونوں دوبارہ خفا ہو گئے۔

لیکن اتنی تنہا زندگی گزارنا بھی دشوار تھی۔ رات کو اپنی ٹرے اٹھا کر میں خود ہی اس کی میز پہ چلا آیا۔

"تمہارا کتا تمھیں پیارا ہے، اپنی ثقافت مجھے۔ کیا اس کتے کے لیے میں اپنا قومی پہناوا چھوڑ دوں؟"

وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی، جیسے کسی نتیجے پر پہنچا چاہتی ہو۔ جیسے ایڈولف ہٹلر کی روح اس میں اتر آئی ہو۔

کھانے کے بعد وہ دوستانہ انداز میں بولی۔" آؤ، وہاں درختوں کے نیچے چائے پیتے ہیں۔"

ہم باہر جا بیٹھے۔ خنکی تھی مگر تھی قابل برداشت۔ سیلف سروس تھی۔ ہم اپنے مگ لے کر دوبارہ نیم تاریک گوشے میں درختوں تلے آبیٹھے۔

"تم اپنا یہ لباس نہ پہنا کرو۔" کلارا نے کافی کا سپ لیتے ہوئے مشورہ دیا۔ وہاں یورو

میں تنخواہ مل رہی تھی۔ میں یہ عرصہ آرام دہ گزارنا چاہتا تھا۔ کافی اس کے حسین چہرے پہ مارتا تو ڈی پورٹ ہی کر دیتے۔ لہٰذا لہجہ دھیما ہی رکھا۔ ''میرے کلچر کا احترام کرو بس۔''

کلارا دلچسپی سے میرے چہرے سے گزرنے والے طوفان دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ ''تمھارا ملک آزاد ہوا تو بنا بنایا ملک تھا جب کہ اسی دور میں جرمنی کے 75 لاکھ افراد مر چکے تھے، 114 چھوٹے شہر تباہ ہو چکے تھے، ایک کروڑ بیس لاکھ جرمن کیمپوں میں اپنے ہی وطن میں مہاجروں کی طرح پڑے تھے۔ 14 ممالک جرمنی کو مالی مدد دے رہے تھے، 12 کروڑ تمھارے ملک نے بھی امداد دی۔ اب وہی جرمنی روزانہ 12 کروڑ کے تو صرف پیپر پن ہی بناتا ہے۔ تمھاری فی کس آمدنی 411 ڈالر ہے اور تمھارے پاس پینے کا صاف پانی بھی نہیں ہے۔''

کافی کی جھاگ کی طرح میرا غصہ بھی ندامت میں ڈوب گیا، کچھ جواب نہ بن رہا تھا۔ پھر اس نے نرالی سی فرمائش کی۔ ''وہ اپنا لباس مجھے دے دو، ضرورت پڑنے پر لے لینا۔''

پھر وہ عام سے شلوار اٹھائے چلی گئی۔ میں حیران ہی رہ گیا۔

کوئی پندرہ روز بعد اس نے پہلی بار اپنے فلیٹ میں مدعو کیا۔ یہ ایک اعزاز تھا۔ اتنی اپنائیت، اس قدر بھروسہ۔ شام میں اس کے فلیٹ پہ دستک دی تو وہ بنی سنور چلی آئی۔ پورا اقدامِ قتل کا ارادہ لگ رہا تھا۔ حسن کی لائٹیں مار رہی تھی۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ پھر گھوم گئی۔ ''تمھارے ہاں شہری آزادیاں نہیں ہیں، حقوق نہیں ہیں۔ تم نے فخر سے بتلایا تھا کہ یوم آزادی پہ ایک ارب کے جھنڈے خرید کر لہراتے ہو۔ تم خود باعقل، باشعور بولو گے؟''

مجھے سخت تپ چڑھی۔

اس نے نگاہیں میرے دل میں اتار دیں۔

''تو پھر یہاں تعلیم حاصل کرنے کا کیا فائدہ۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا ڈگری کی صورت میں

ساتھ لے جاؤ گے؟ تم تو نہیں بدلے۔ میں نے لیلیٰ کا ذہن بدل دیا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔"
وہ مجھے پہلو کے کمرے میں لے گئی۔

اپنا پورا لباس پہنے میں ٹنگا کھڑا تھا۔ میرا چہرہ نہ تھا۔ میرا ہی بھیج کا گ تھا۔ وہی لباس، کندھے پہ چادر اور سر پہ سفید چترالی ٹوپی۔ کئی روز اس بھیج کا گ کے ساتھ رہ کے لیلیٰ نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا، دوستی کر لی تھی۔

کلارا نے مسکرانے کی کوششیں کی۔ "اپنے دماغ سے قدیم بھیج کا گ نکال دو، جس سے میں نے لیلیٰ کی طرح دوستی کرا دی ہے۔ چلو کھانا کھاتے ہیں۔"

معمورہ فرنگی

ہنری کو پُر اسرار چیزوں سے بڑی دلچسپی تھی۔عام انگریزوں کے برعکس وہ پہاڑی غاروں کے قدیم مندروں مقابر اور جنگلوں میں گھومتا پھرتا۔اس کی پیدائش لورالائی میں ہوئی تھی۔لورا اور لائی نامی برساتی نالوں کے درمیان واقع یہ بستی لورالائی کہلاتی جس کا تلفظ بھی انگریزوں کے لیے سہل تھا۔انھوں نے'ڑ' نکال دی تھی نام میں سے۔

ہنری نے کاروبار کا سوچا کیوں کہ تنخواہ دار کبھی امیر کبیر نہیں ہو سکتے۔وہ عمر بھر چادر کے مطابق ہی پاؤں پھیلاتے سکڑتے رہتے ہیں۔بلوچستان ایجنسی میں برٹش آرمی کے لیے بڑے بڑے سپلائی آرڈ ملتے۔گھوڑوں کا ساز و سامان، خیمے، وردیاں، خوراک کی سپلائی اور جانے کیا کیا۔جبکہ بلوچستانی تھوڑی سی کاشتکاری اور غلہ بانی تک ہی محدود تھے۔ہنری نے انگلینڈ میں بھی تعلیم حاصل کی۔مگر دل اس کا جنم بھومی میں ہی پڑا رہتا۔اس کا تعلق حاکم قوم سے تھا، وہ جہاں بھی جاتا تحصیلدار اور لیویز والے پیشوائی کے لیے دوڑ پڑتے، ضلعی حکام پر بھی پابندی تھی کہ جونہی کوئی انگریز ان کے علاقے میں آئے فوراً ہی ریکارڈ میں درج کر کے اس کی خاطر مدارت کریں۔گھوڑے یا پھر گھوڑوں کے لیے چارہ کیمپنگ کا سامان مہیا کریں۔ آس پاس کے دیہات سے بیگار پکڑلیں۔

ہنری نے زیارت کے بارے میں بھی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ بہت سے عجیب و غریب واقعات اس علاقے سے وابستہ تھے۔ سنڈیمن نے اس کا نام غواشکی (محفوظ مقام) بدل کے زیارت رکھ دیا کیوں کہ انگریز بجائے غواشکی کے وسکی کہنے لگے تھے۔ سنڈیمن سے زندگی نے وفا نہ کی۔ اس نے پینتیس ہزار کی ناقابل یقین رقم سے برماسا گوان سے گوتھک ڈیزائن کی ایک ریزیڈنسی بنوائی تھی، مگر خود لطف اندوز نہ ہوسکا۔ اتنا بڑا ٹھیکہ سوراب جی اور رامریک سنگھ نے مل کر لیا تھا۔ زیارت جانے کے لیے بوستان سے چھوٹی پٹری کی ریل پکڑتے جو مانگی ریلوے اسٹیشن پہنچا دیتی۔ یہاں گھوڑا گاڑیاں، خچر، گھوڑے بار برداری کے چھکڑے مل جاتے۔ ان پہاڑی راستوں پہ سفر خطرناک بھی تھا اور مشکل بھی۔ ایک رات راہ میں گزارنا ہوتی۔ اگلے روز کہیں سہ پہر میں زیارت پہنچتے۔ لیکن اچھے گھڑسوار ایک ہی دن میں زیارت جا پہنچتے۔

ہنری کو بہت شوق تھا کہ وہ بھی زیارت کی سیاحت کرے، راستے میں چھپر رفٹ کے پاس درگا دیوی کا مندر تلاش کرے، جسے اکثر ہندو گیانی کھوجتے پھرتے۔ انگریزوں نے ریل راہ میں رکاوٹ کے باعث مندر کو جانے والی تنگی (دراڑ) بارود سے اڑادی تھی۔ علاقے کا نام درگا دیوی کی مناسبت سے درگئی تھا؛ یعنی درگا کی جاگیر۔ اسے بدل کر چھپر رفٹ کر دیا۔ ہنری نے سفر اختیار کیا تو کیپٹن شوورز نے اپنے کچھ سپاہی بھی ساتھ کر دیے۔ نیٹو اسسٹنٹ کمشنر پنڈت نندلال نے تحصیلدار گرمکھ سنگ کو ساتھ ساتھ رہنے کی تاکید بھی کی۔ یوں ہنری کے ساتھ اچھا خاصا لشکر بھی چل دیا۔ ہنری نے کالی پت کے پہاڑ پہ ایک مربع میل کا دائرہ بھی دیکھا کہتے ہیں کہ کالی کا سیوک ایک بار خالی پت (گول کاسہ) لیے فریادی بن کر چلایا، ''ماں! آج تیرے سیوک کو دان دینے والا بھی نہیں رہا، کیسا کلجگ ہے۔'' صنوبر کے جنگلوں کی بلند چوٹیوں سے کالی ماں ظاہر ہوئی۔ فرطِ غضب سے اس نے کاسہ لے کر جو فضا میں اچھالا تو مانوں بھیروں ناچ گئی۔ ایک زناٹے سے پت، جنگلوں، پہاڑوں کو زلزلے کی طرح روندتا ہوا قیامت خیز دھماکے سے چٹانوں سے یوں ٹکرادیا کہ میل بھر کا گول نشان بن گیا، ہندو دوڑ

پڑے۔ کالی کے سیوک کے قدموں میں جا گرے۔ سیوک بھی درواسا۔ رشی (جس نے شکنتلا کو شراپ دیا تھا) جیسا غصے والا نہ تھا، وہ بھی دیوی کو منانے لگا۔ تب سے یہ پہاڑ کالی پت (کالی کا کاسہ) کہلایا۔ اور بابا طاہر جب زہد وریاضت کے باعث نانا صاحب کے مقبول خلیفہ ٹھہرے تو آپ کو ایک خروار بزرگی دی (چار بوری مجازاً بہت زیادہ) جس کے باعث بابا خرواری مشہور ہوئے۔

ہنری کو ایک بے کلی سی تھی، جستجو تھی، وہ زیارت کا پورا علاقہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈمیارہ پہاڑ بھی دیکھا۔ قبیلے کا نوجوان مدھر بانسری بجایا کرتا تھا اور سردار کی بیٹی سے شادی کا خواہاں تھا۔ قبیلے کے اصرار پہ سردار مجبور ہو گیا تو اس نے یہ عجیب شرط رکھی کہ اگر وادی کے چشمے سے وہ بانسری بجاتا ہوں دو ہزار فٹ بلند چوٹی پہ جا پہنچے تو بیٹی بیاہ دے گا۔ ایک روز سبھی اکٹھے ہوئے۔ نوجوان نے بانسری تھامی اور بانسری بجاتا پہاڑ پہ چڑھنے لگا۔ اس کے ہمراہ عزیز دوست اور قبیلے کے مشّران بھی تھے۔ بانسری بجاتے، وہ جب چوٹی کے کافی قریب جا پہنچا تو اچانک ہی اس کے سینے سے خون ابل پڑا۔ بانسری خون میں بھیگ گئی۔ صوفیا نے فتویٰ دیا کہ عاشق صادق ہے، اسے اسی لباس میں دفن کیا جائے۔ صدیوں بعد بھی لوگوں کو بانسری بجاتا ڈمیارہ کی چوٹی کی جانب بڑھتا جوان دکھاتا۔ خصوصاً چاندنی راتوں میں تو بانسری کی مدھر تان سے صنوبر کا جنگل ہی گونج اٹھتا۔

ہنری نے وہ علاقہ بھی دیکھ ڈالا اور انژرگہ جا پہنچا جہاں زیتون کا قدرتی جنگل ہے، جسے لوگ استعمال تو کرتے ہیں، مگر لکڑی نہ توڑتے کہ قرآنِ حکیم میں زیتون کا ذکر ہے۔ ہنری نے انار کے جنگل دیکھے جو ہزاروں برس سے آباد تھے، جن کی آبیاری قدرت کرتی تھی۔ کروڑوں برس قبل جب کچھ کا آتش فشاں بیدا ہوا تھا اور زیارت پر لاکھوں برس شینکیَ (آتش فشانی راکھ) برستی رہی تو بھی زیتون انار اور صنوبر کے جنگل سرسبز و شاداب رہے۔ کیمپ لگاتے وہ آگے ہی بڑھتا رہا۔ اس کا اپنا کاروبار منشی ہی سنبھالتے کوئی نیا آرڈر بھی نہ ملا تھا، ورنہ تو زیارت

ڈاک خانے کا تار والا گھڑ سوار چلا آتا۔ زیارت میں ٹھہر کر وہ سکینڈ رائٹل ڈبلن سیون بمبی لانسر بائیسویں پنجاب انفینٹری سے ملا۔ اسسٹنٹ کمشنر دسورام سے کہا کہ اگر اس کا پروٹوکول بہت ہی ضروری ہے تو بہت ہی دورہ کر گھڑ سوار اس کے گرد حفاظتی حصار رکھیں۔ انگریز تو معززین کو خانہ نشینی وظیفہ دیا کرتے کہ سکون سے گھروں میں رہیں۔ سرکار سے جھگڑا نہ کریں۔ زیارت میں ایک مندر اور سکھوں کا ایک گردوارہ بھی تھا۔ زیارت کے دونوں قبائل سنرزئی اور سرزئی سیاحوں سے اچھا سلوک کرتے اور غیر مسلموں سے بھی ہمدردانہ رویہ رکھتے، جس کے باعث زیارت کو سیاحوں کی جنت کہا جاتا۔ سونا اچھالتے چلے جائیں، کوئی نہ پوچھتا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔

ژڑری، کروبی کچھ، سوکر سکائی چونکہ زیارت سے دور تھے، ویران تھے، زیادہ حسین تھے۔ سچ کہتے ہیں کہ انسان کے قدم بڑھانے سے قدرتی حسن پیچھے ہٹنے لگتا ہے۔ چرند پرندے نباتات تو کیا روحانیت بھی کم پڑنے لگتی ہے۔ ہر سال جب اکتوبر میں سردی پڑتی برف باری شروع ہوتی تو زیارت کے قبائل شاہ رگ، ناکس، زرد آلو اور ہرنائی کی جانب نکل جاتے۔ وہاں بھی مشقت کرتے۔ فصلیں اگاتے، کام نہ ملنے پر ریلوے اسٹیشنوں پہ گینگ مین، چوکیدار، پنکھا پلر کی نوکریاں حاصل کر لیتے۔ مارچ میں برف پگھلنے لگتی۔ راستے کھلتے تو ڈمیارہ کی بلندیاں عبور کرتے دوبارہ اپنے گھروں کو آباد کرتے۔ فاصلہ تو کچھ زیادہ نہ تھا مگر پہاڑی پگڈنڈیوں کو مال مویشی اسباب کے ہمراہ گدھوں، خچروں کے بھروسے عبور کرنا خاصا جان لیوا کام تھا۔ ذرا لغزش ہوئی تو سیکڑوں فٹ نیچے گر جاتے۔ چھ ماہ بعد وہ دوبارہ چلے آئے۔ ایک رات پیڑی میں گزارتے۔ گنئے جنگل کے اس حسن میں وہ شکار بھی تلاش کر لیتے۔ مارخور، چکور اور جانے کیا کیا۔ بھیڑیے اور چیتے بھی یہاں زیادہ تھے۔ اس سے بچاؤ کا اہتمام بھی کرتے۔ خیمہ گاہوں کے ساتھ پہرہ ہوتا۔ رات بھر آگ بھی چلتی۔ پڑانگ (چیتا) دبے پاؤں آتا، کوئی بکری اٹھا کے ہی لے جاتا۔ بھوکے بھیڑیے بھی تاک میں ہی رہتے۔

ہنری کو پیڑی کا جنگل بہت پسند آیا، آبادی سے دور خیمے لگوا دیتے۔ لیویز اور ملازمین کی فوج بھی ساتھ ہی بس گئی جس میں پچاسویں بمبئی انفنٹری کے چند سپاہی بھی شامل تھے۔ ہنری کو شکار کا شوق نہ تھا۔ ہندو اور بدھ تعلیمات کے باعث وہ جنگلی جانوروں کو مارنے کے خلاف تھا، مگر ڈیورنڈ لائن کھینچ کر افغانستان کے بہت سے علاقے جو برٹش بلوچستان میں شامل کیے تھے۔ اس کے باعث پٹھان مجاہد جہاں کہیں اکیلا دکیلا انگریز دیکھ پاتے خنجر تلوار سے پار کر دیتے۔ اوّل تو بندوقیں کم کم تھیں اور پھر فائر نے شور سے محافظ دوڑ پڑتے۔ ہنری ہمیشہ اسلحہ اپنے ساتھ رکھا کرتا باوجود کہ وہ امن پسند تھا۔ پیڑی میں تھوڑی سی آبادی تھی۔ کوئی پچیس تیس گھر رہے ہوں گے۔ قافلے، سیاح، لیویز کے سپاہی دور سے گزر جاتے، کیونکہ آبادی میں داخلہ معیوب سمجھا جاتا کہ یوں بے پردگی ہوتی ہے۔ جس کے باعث خواتین روزمرہ کے کام بخوبی انجام دیتیں۔ گدھوں پہ پانی لانا جنگل سے قدرتی سبزیاں لانا، چکوروں اور چھوٹے جانوروں کے لیے دام لگانا ان کے لیے معمول کی بات تھی۔

ہنری پیدل ہی گھومتا پھرتا۔ ان پہاڑی راستوں پہ نکل جاتا۔ ان جنگلوں میں ایک نرالا سکون تھا۔

ایک روز اچانک ہی دو حملہ آور اس پہ ٹوٹ پڑے۔ پستول کا بند ہونا موت کی علامت تھی۔ وہ دونوں کا مقابلہ کرنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ ایک خشک لکڑی سے وہ بچاؤ کر رہا تھا کہ بازوؤں پہ زخم آگئے۔ وہ سینے کو بچائے جا رہا تھا، منہ موڑ کر بھاگنا ممکن نہ تھا۔ پستول چھوٹ گرا تھا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ایک قیامت کا سماں تھا۔ اچانک ہی ایک لڑکی کلہاڑی لیے لپک کر سامنے آگئی۔

اس نے کلہاڑی تولی۔ ”پیچھے ہٹ جاؤ، یہ ہمارا مہمان ہے۔“

حملہ آوروں کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ ”انگریز میرے بھائی کے قاتل ہیں، مجھے بدلہ لینا ہے۔“

بدلہ لینا پشتون ولی (پٹھان کا رواجی سماجی غیر تحریری قانون) میں لازم ہے۔

مگر وہ لڑکی نہ ہٹی۔ "یہ میرا گاؤں ہے، ہماری پناہ میں ہے یہ۔"

لڑکی اب حملے کے لیے تیار تھی۔ اس کے جسم میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ ان پہاڑوں سرکش جنگلوں کی بیٹی تھی۔

دونوں حملہ آوروں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور خنجر نیچے کر لیے۔

"وہ پڑی ہے تمہاری چادر اوڑھ لو۔"

دونوں ان درختوں میں غائب ہو گئے۔

لڑکی نے مڑ کر دیکھا تو ہنری پہ ایک بجلی سی کوند گئی۔ جیسے کالی دیوی نے کاسا اس پہ اچھال پھینکا ہو۔ جیسے شکار کی یونانی دیوی ڈائنا سامنے کھڑی ہو، جیسے جان آف آرک نے نئی زندگی دی ہو۔

وہ گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور سر جھکا لیا۔ کیوں کہ چہرے پہ نگاہیں رکھنا نامناسب تھا۔

لڑکی نے پلٹ کر چادر اٹھائی۔

ہنری کے بازو اور ہاتھ لہولہان تھے۔ وہ بھی ہمت کر کے بڑھا۔ اس قابل نفرت پستول کو اٹھایا جو وقت پہ دھوکہ دے گیا۔ دوست سچ ہی کہتے تھے کہ پستول سے تو ریوالور کہیں بہتر ہے۔ ایک گولی نہ بھی چلے تو باقی چل جاتی ہیں۔

پیڑی کے مردوں نے دیکھا کہ ایک زخمی انگریز آ رہا ہے، جس کے عقب میں معمورہ چلی آ رہی ہے۔ گدھے پہ پانی ہے اور کلہاڑی جھول رہی ہے تو وہ مدد کے لیے دوڑ پڑے۔ زخم باندھے، لیپ لگائے، کھانے کو دیا۔

اُدھر کیمپ میں کھلبلی مچ گئی۔

رات اتر آئی تھی۔ مشعل بردار آوازیں دیتے جنگل میں پھیل گئے۔

پیڑی کی جانب آئے تو ہنری مل گیا، جسے خوب آرام سے تکیے لگا کر آتش دان کے ساتھ نیم دراز کر رکھا تھا۔

تیز رفتار گھڑ سوار زیارت کے کیمپ پہنچا اور ڈاکٹر اپنے اسٹاف کے ساتھ گھوڑوں کی ٹاپوں میں آپہنچا۔ پیڑی میں رات جاگ اُٹھی۔ الاؤ روشن ہوئے۔ مہمانوں کے لیے کھانے تیار ہونے لگے۔ جگہ جگہ مشعلیں، لالٹینیں روشن تھیں۔ حملہ آوروں کے بارے میں مورس لائن پر پیغام دوڑنے لگے۔ علاقے بھر کے لیویز تھانے، ملیشیا، قلعے، پہاڑوں، جنگلوں میں نکل پڑے۔ کسی انگریز پہ حملہ بہت بڑی بات تھی۔ سبھی کو نوکری کی پڑی تھی۔ نوکری بچانے، انعام و جاگیر پانے کا نادر موقع تھا۔ خان بہادر، رائے بہادر کا خطاب طلب کرنے والے بیکل ہو گئے۔

ہنری نے ایک عجیب سا مطالبہ کیا کہ وہ پیڑی میں ہی رہے گا، یہیں علاج کرائے گا۔

کچھ فاصلے پر خصوصی کیمپ لگا دیا گیا۔

ہنری تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔

ریوالورے کر وہ اِدھر اُدھر نکل جاتا اور سپاہی دائیں بائیں چھپتے چھپاتے اس کی نگرانی کرتے۔

تین ہی روز میں حملہ آور پکڑے گئے۔

شناخت کے لیے انہیں ہنری کے پاس لایا گیا۔

شاید ان پہ تشدد کیا گیا تھا، بھوکا رکھا گیا تھا۔ بڑے ہی خستہ حال تھے۔ ہاتھوں میں آہنی ہتھکڑیاں تھیں۔ ہنری کے خیمے کے باہر انہیں بٹھا دیا گیا۔

ہنری نے انہیں پہچان لیا۔

مگر قریب آ کر مسکرایا۔ "یہ کن کو پکڑ لائے ہو؟"

افسر گنگ رہ گئے۔

"یہ تو اقرار بھی کر چکے ہیں"۔ وہ منمنائے۔

"زبردستی اقرار کرایا ہوگا" ہنری بے رخی سے بولا "ان کی ہتھکڑیاں کھول دو۔"

مرتے کیا نہ کرتے، انہوں نے دونوں کو آزاد کر دیا۔

ہنری انہیں خیمے میں لے آیا۔ انہیں ساتھ ہی کھانا کھلایا۔ اور دو گھوڑے دلوائے کہ نکل جائیں۔ انہیں روپے بھی دیے۔ جبکہ وہ مبہوت سے تھے۔ "تم نے پشتون ولی کا احترام کیا، خاتون کو بھی عزت دی، تم عزت کے قابل ہو، انسان تو کیا میں نے تو کوئی مارخور بھی نہیں مارا۔ میں نے کبھی کسی کو نہیں مارا۔ جاؤ، چلے جاؤ۔"

وہ دونوں نکل گئے تو اس نے عملے کو تعریفی خط لکھ کر دیے کہ افسران کے پاس لے جائیں۔ جن میں تاکید تھی کہ حملہ آور پکڑنے پر انہیں انعام اور ترقی دی جائے۔ نیٹو (Native) عملے کی باچھیں کھل گئیں۔ ہنری نے خود ہی وضاحت بھی کی کہ میں مسیحی ہوں، میرے عقیدے میں معاف کرنے کا حکم ہے، انھیں ڈھونڈنا پکڑنا بڑی بات ہے۔ انعام تو تم لوگوں کا حق ہے۔ ویسے وہ تھے وہی حملہ آور، جنھیں تم نے جانے کس طرح کھوج نکالا۔

زیارت پہنچتے ہی ہنری دوستوں سے ملا اور دھماکہ خیز خبر سنائی کہ وہ معمورہ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ سبھی حیران رہ گئے۔ پہلے تو کچھ روز دیوانگی قرار دیتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ سبھی سنجیدہ ہو گئے۔ پنڈت دیا شنکر کا اعلان تھا کہ معمورہ دراصل پچھلے جنم کی ساتھی رہی ہوگی۔ تبھی روح نے روح کو پہچان لیا۔ جبکہ نیٹو ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لالہ جھانکی رام کا مشورہ تھا کہ علما کو بیچ میں ڈال کر بات چلائی جائے۔ کیوں کہ پٹھانوں نے شال کوٹ کی چھاؤنی میری پر شدید حملہ کر کے محاصرے میں رکھا تھا۔ تو شکر ہے کہ ان کے پاس دور مار بندوقیں نہ تھیں، ورنہ سارے کے سارے فوجی مارے جاتے۔ کئی روز بندوقچی (Fusiliers) میری کے جھروکوں سے تاک کے گولیاں چلاتے رہے تھے۔

علما نے تعجب سے یہ درخواست سنی۔ یوں تو مسیحی ہونے کے ناطے ہنری اہلِ

کتاب تھا، مگر صورت حال کا تقاضا تھا کہ نہایت ہی چابک دستی سے معاملہ چلایا جائے، ورنہ انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ ہو جاتا۔ انگریزوں نے ایک عرصہ مشنری سرگرمیوں پہ بھی پابندی لگائے رکھی تھی تاکہ ہندوستانی بھڑک نہ اٹھیں۔ انہیں تو اپنی کالونی سے مال اینٹھنے کی پڑی تھی۔ مشران کی مدد لی گئی۔ نیٹو آفسر بھی رشتے کی حمایت کرتے کہ یوں ایک انگریز بھی دائرہ اسلام میں آجائے گا۔ خدشہ تھا کہ خفا نہ ہوں۔ لہٰذا پیار محبت لجاجت سے بات کرتے۔ دوستوں نے شادی کی بات چھیڑی تو رفتہ رفتہ دباؤ بڑھنے لگا۔

اُدھر معمورہ کے خاندان نے دو شرائط رکھیں؛ اول یہ کہ ہنری مسلمان ہو جائے گا۔ دوم یہ کہ معمورہ اسی علاقے میں رہی گی۔ یوں تو DISSIDENT ہونا بھی بڑی بات تھی، یہ تو عقیدہ ہی تبدیل کرنے کی آزمائش تھی۔

مگر ہنری نے دونوں شرائط تسلیم کرلیں۔

ہنری کا حلیہ بدل گیا۔ شلوار قمیص میں ملبوس سر پہ پگڑی اور داڑھی بڑھالی۔ یوں شادی کے بعد وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اس کا اپنا کاروبار ملازمین کے ذریعے چلتا رہا۔ چوں کہ پیڑی میں رہتے ہوئے نگرانی ممکن نہ تھی، اس نے شاہ رگ میں گھر بنایا۔ دوسرا گھر گرمیوں کے لیے زیارت میں بنایا (موجودہ ایف سی ریسٹ ہاؤس)۔ اس نے اسلام کی حقانیت کو دل سے قبول کیا۔

لوگ معمورہ کو معمورہ فرنگی کہنے لگے۔

ہنری جمعہ میں صف اول میں دکھائی دیتا۔

موسم گزرتے رہے۔

اسے والدین کی بیماری کا علم ہوا تو اجازت لے کر معمورہ کے ہمراہ شاہرگ ریلوے اسٹیشن سے براستہ مانگی ریلوے اسٹیشن وہ بوستان پہنچا۔ جہاں سے بڑی پٹری کی ریل پہ کوئٹہ اور وہاں سے کراچی پہنچے۔ بحری جہاز کے تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ دونوں انگلینڈ جا پہنچے۔

یہاں بہت دنوں عزیز و اقارب ان کی راہ دیکھتے رہے۔

موسم بدلتے رہے۔

انگریزوں کے خلاف تحریکیں چلنے لگیں۔

ہندوستان بھر میں آزادی کے نعرے گونجنے لگے۔

قوم پرست اور کمیونسٹ مکمل آزادی اور سوراج کی بات کر رہے تھے۔ جبکہ گاندھی اہنسا کے ساتھ خودمختاری اور ڈومین پر رکنا چاہتا تھا۔ اختلاف بڑھا تو اس نے آزادی پسندوں کو مع نیتاجی سبھاش چندر بوس کانگریس سے ہی نکال دیا۔ ہندوستان کے تمام لیڈر انگریزوں سے تعلیم حاصل کرنے والے ہی تھے۔ ان کے لب و لہجے میں نرمی اور انگریزوں کے لیے نرم گوشہ تھا۔ وہ ذہنی طور پر انگریزوں کے غلام تھے۔ آزادی کی دو تحریکیں پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں۔

انگریز اپنے حواریوں، نوابوں کی تحریک کی سرپرستی کر رہے تھے۔

ماہ و سال گزرتے رہے۔

دوسری عالمی جنگ شروع ہوگئی۔

اُدھر سبھاش چندر بوس نے آزاد ہند فوج بنا کر برما کے راستے برٹش انڈیا پر حملہ کر دیا۔ مسلمان، ہندو، سکھ اس فوج میں شامل تھے۔ آزاد ہند کے اکثر جرنیل بھی مسلمان ہی تھے۔ جرمنی جنگ تو نہ جیت سکا مگر اس نے برطانیہ کی کمر توڑ دی۔ ہندوستان پر مزید قبضہ رکھنے کے لیے لازم تھا کہ پچاس ہزار انگریز فوجی ہندوستان میں رہیں۔ جبکہ انگریزوں کے پاس تو لندن میں ٹیکسی چلانے کے لیے بھی مرد نہ بچے تھے۔

معمورہ کا شوہر اور دونوں بیٹے ملک کا دفاع کرتے جانوں کا نذرانہ دے گئے تھے۔ بمباری سے ان کا گھر کھنڈر بن چکا تھا۔ خندقوں میں زندگی گزار رہے تھے۔ ہر طرف ملبہ بکھرا پڑا تھا۔ زخمیوں کی چیخ و پکار علاج کا فقدان، قیامت کا منظر تھا۔

عالمی جنگ سات برس کے بعد 1945ء میں ختم ہوگئی۔ ان پینتیس برسوں میں

زیارت تک پکی سڑک بھی بن گئی تھی جو قاسم تنگی کو چھوڑ کر نکالی گئی تھی ۔ پہلے بھاپ سے چلنے والی بس چلائی گئی پھر پٹرول بس آ گئی ۔ جولائی 1942ء میں ایک زبردست زلزلے نے چھپر رفٹ میں یوں دراڑیں ڈالیں کہ انگریز بوستان سے شاہ رگ کی چھوٹی پٹری اٹھا کے لے گئے ۔ جنگ میں یوں بھی فولاد کی سخت ضرورت تھی ۔ سارے ریلوے اسٹیشن اجڑ کے رہ گئے ۔ مانگی ریلوے اسٹیشن کی صرف دیواریں ہی رہ گئیں ۔

لوگ معمورہ کو بھول چکے تھے ۔ کبھی کبھی برف باری کی سرد راتوں میں آتش دان کے سامنے بیٹھی لڑکیاں فرمائشیں کرتیں تو انہیں کہانی سنائی جاتی ۔ زیبِ داستان کے لیے اس میں دلچسپ اضافے بھی کیے جاتے ۔ زیارت کے گھر پہ برٹش آرمی نے قبضہ کر لیا تھا ۔ شاہرگ کا گھر بدستور اس کے رشتہ داروں کے پاس تھا ۔ ٹیلی فون بھی ڈاک خانوں میں آ چکا تھا ۔ مگر کوئی سندیسہ نہ آیا ۔ نہ ہی وہ کسی طور پر رابطہ قائم کر سکتے تھے ۔

ہندو مسلم فسادات کی ابتدا یوں تو 1920ء سے کرادی گئی تھی ۔ انگریز ہندوستان میں بہت سے راجواڑے بنانا چاہتا تھا ۔ تاکہ وہ اس سے اسلحہ خرید کر باہم لڑتے رہیں ۔ دو مذہبی کی بجائے اس نے دو قومی کا پرچار کیا ۔ فاصلہ بڑھایا ۔ حالاں کہ ہندو دلت، شودر، پنڈت ایک قوم نہ تھے اور اگر عقیدے سے قوم بنتی تو مسیحی بھی قوم کہلاتے ۔ جنہیں ہندوستان میں افرادی قوت حاصل تھی ۔

فسادات کو مزید ہوا دی گئی ۔

معمورہ کی کوئی خیر خبر نہ تھی ۔ جانے جرمن ہوائی بمباری (BLITZ) میں کہیں جل کرستی ہو گئی یا کہ کسی حفاظتی خندق میں زندگی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی ہو ۔ بس دعائیں ہی تھیں ، عزیز و اقارب جاننے والے دعائیں ہی کیا کرتے ۔ انہیں خاصی تشویش لاحق رہتی ۔

مارچ 1947ء میں شاہرگ ریلوے اسٹیشن پہ اطلاع آئی کہ ایک انگریز لیڈی ریل سے آئے گی ۔ شایانِ شان استقبال، پروٹوکول اور حفاظت کا اہتمام کیا جائے ۔

سرکاری عملہ محتاط ہو گیا۔ سپاہی بھی پہنچ گئے۔ سرکاری فٹن اور لیویز گھڑ سوار بھی موجود تھے۔

انگریز لیڈی نے یورپین کی بجائے مقامی لباس پہن رکھا تھا۔

اسٹاف دوڑ پڑا۔ تحصیل دار نے اپنا تعارف کرایا۔ اسٹیشن ماسٹر بھی پیچھے نہ رہا۔ سپاہیوں نے حصار میں لے لیا۔

لیڈی کو پشتو بولنے کا شوق تو تھا مگر اس کوشش میں انگریزی کے ٹوٹے ہی لگانے لگی۔

اس نے معمورہ فرنگی کے گھر جانے کو کہا۔

سرکاری ہجوم میں گھر پہنچی تو بلا تکلف کیواڑ کھول کر اندر چلی گئی۔

خواتین شرما کر اِدھر اُدھر چھپ گئیں۔ وہ لیڈی سے بھی پردہ کر رہی تھیں۔

لیڈی نے مختلف نام پکارے تو ایک معمر خاتون اپنا نام سن کر چلی آئی۔ مگر چادری سے پردہ کے لیے رہی۔

''تم میرا نام کیسے جانتی ہو؟'' وہ متحیر تھی۔

لیڈی اس سے لپٹ گئی۔ ''میں معمورہ ہوں، معمورہ فرنگی۔''

دونوں کے آنسوؤں نے وقت کا شیلہ پاٹ دیا۔

حاشیہ

خروار : ایک گدھے کا بوجھ زمانہ قدیم کا سب سے بڑا پیمانہ چار بوریاں

مشران : قابل احترام بزرگ

شال کوٹ : کوئٹہ کا قدیم نام

میری :Mud Volcano پہ خان قلات کا صدیوں پرانا قلعہ

شیلہ : پہاڑ کا برساتی نالہ

DISSIDENT :اپنے عقیدے کی حدود سے باہر نکلنا

شُوم کا مال

زندگی بہت ہی رنگین اور دلکش تھی۔اسکول سے چھٹی ہوتی تو اسلامیہ اسکول کی وردی بدل بستہ پٹخ کر دوستوں کے ہمراہ نکل جاتا۔میرے والد محمد اکبر خان ان دنوں ڈسٹرکٹ انسپکٹر اسکولز کوئٹہ ڈویژن تھے۔بلوچستان کو تو بلوچستان کہنا بھی جرم تھا۔سبھی اسے کوئٹہ قلات ڈویژن ہی پکارنے پہ مجبور و معذور تھے۔ہر جانب دہشت کی فضا تھی۔فلموں کی طرح ہماری سرکار بھی مار دھاڑ سے بھرپور شاہکار تھی۔بابا بتاتے کہ انگریز ایسے ظالم سنگ دل اور کمینے نہ تھے۔بازارِ حسن، گتے خانے، چنڈو خانے، جوئے کے اڈے سبھی کچھ آباد تھے، شاد باد منزلِ مراد تھے۔صرف حقوق مانگنے پر پابندی تھی۔جو کوئی زبان کھولتا سرکاری ٹرک اسے مفت میں قلی کیمپ پہنچا دیتا۔یہ ایک عقوبت خانہ تھا۔انگریز گئے تو یہ یہیں چھوڑے گئے۔حکمران بنیادی حقوق مانگتے شہریوں کو پکڑ پکڑ کر قلی کیمپ لے جا کر تشدد کیا کرتے۔بلوچستان کا شاید ہی کوئی لیڈر قلی کیمپ یافتہ نہ رہا ہو۔سبھی اس کوچہ یار کے اسیر رہے۔اگرچہ پانی کی کمی تھی مگر لیڈران پہ سرد پانی انڈیل کر کھلے آسمان تلے باندھ دیا جاتا۔

میں نے ضد کر کے، لڑ جھگڑ کر سبز رنگ کا ہمبر سائیکل والد سے حاصل کر لیا تھا۔ہم سبھی دوست سائیکلوں ہی نکل جاتے خوب تفریح رہتی۔چونکہ والد افسر تھے، لوگ بھی خیال رکھتے۔

خصوصاً محکمہ تعلیم سے تو لوگ تو زیادہ ہی لاڈ لگاتے۔

اتنے میں بابا کی تبدیلی قلات ڈویژن ہوگئی۔ جو زلف یار کی طرح طویل تھا۔ اسپیز نڈ سے شروع ہو کر جھٹ پٹ، ایرانی سرحد سے گوادر اور حب تک پھیلا ہوا تھا۔ ہیڈ کوارٹر خضدار تھا، جہاں جانے کا یارا نہ تھا۔ ہر پندھرواڑے ملیشیا کے ٹرکوں کے ہم راہ خضدار جاتے، اگلے ہی روز لوٹ جاتے۔ تمام دفاتر مستونگ میں کام کرتے۔ سرکار سے نالاں لوگ پہاڑوں سے جہاں موقع ملتا' افسروں پر گولیاں برساتے۔ اس لیے زندہ واپس لوٹ آنے پہ سبھی مسرور ہوتے۔

مستونگ میں ہمیں شاہی باغ کے قریب ہی سرکاری رہائش مل گئی۔ چوہدری موہن لال کی دو بسیں تھیں جو کوئٹہ مستونگ کے مابین چلتیں۔ کاروبار ہندوؤں کے ہاتھ میں تھا۔ بٹوارہ ہوا تو خان قلات نے منادی کرادی کہ ہندو ہمارے بھائی ہیں، سیاسی تقسیم کے باعث ان سے چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے۔ ریاستی حکم کے باعث ریاست قلات کے ہندو قتل عام اور لوٹ مار سے محفوظ رہے، وہ بدستور کاروبار کرتے رہے۔

چوں کہ نویں جماعت اہم تھی، بابا مجھے مستونگ اسکول میں داخل کرانے پہ راضی نہ ہوئے۔ البتہ چھٹی کے دنوں میں یا پھر اتوار کو میں بھی مستونگ چلا آتا۔ یہاں بہت سی شخصیات سے تعارف ہوا، جن کے ہاں بابا کا آنا جانا رہتا۔ میں بھی ساتھ ہی ہولیتا۔ ملک سعید دہوار، ملک فیض، محمد یوسف زئی، وزیر دربار ملک اللہ بخش، بابائے براہوئی نور محمد پروانہ جو مستونگ سے اخبار 'ایلم' (بھائی) نکالتے تھے۔

اُن دنوں ملنے ملانے کا بہت رواج تھا۔ وسیع دسترخوان، مہمان نوازی اعلیٰ صفت شمار ہوتی۔ مجھے ذاتی طور پر سیٹھ طوطارام بہت ہی اچھا لگا۔ بڑا ہی نستعلیق انسان تھا۔ ہندوؤں والی سفید پگڑی پہنتا۔ اچھا خاصا امیر کبیر انسان تھا۔ سنگر میں اس کے باغات تھے، زمینداری تھی، کاروبار بھی تھا۔ اس دولت مندی کے باوجود نہایت ہی انکساری سے پیش آتا۔ اس کا مہمان

خانہ ہمہ وقت آباد رہتا۔ چونکہ حویلی نما مکان سڑک کے قریب ہی تھا، آتے جاتے اس کے ہاں ٹھہر جاتے۔ کھانا، چائے، گپ شپ اور پھر آگے نکل جاتے۔ خاصا تعلیم یافتہ انسان تھا۔ مختلف مذاہب پہ اس کی گہری معلومات تھیں۔ ویسے تھا وہ انسان دوست۔ بابا جب گپ شپ مارتے تو اجازت لے کر میں اس کے ملازم کے ہمراہ باغوں میں نکل جاتا۔ کاریز یا لبِ جو بیٹھ کر سارا حسن دل میں سمو لینا چاہتا۔

جب کبھی عصر سے رات گئے تک اس کے ہاں محفل جمتی تو اس کی اکثر باتیں میرے سر سے گزر جاتیں۔ ویاس کی شریمد بھاگوت گیتا کے اٹھاراں ابواب اسے ازبر تھے۔ والمیک جی کی رامائین پہ بولتا تو کہانیاں میرے دل میں اترنے لگتیں۔ زرد زرد بلبوں کی روشنیوں میں وہ مجھے قدیم داستان گو دکھائی دیتا۔ جو سر شام الاؤ کے ساتھ بیٹھ کر دلی کے باقر قصّہ گو کی مانند کہانیاں سنایا کرتا۔ فارسی ادب پہ بھی اسے عبور حاصل تھا۔ اچھا بھلا پروفیسر نما کاروباری تھا۔ سرکار دربار میں بھی اثر و رسوخ تھا۔ وہ جانے کیوں ریاست قلات کا وفادار تھا۔ ریاست ڈوبنے سے وہ نراش رہتا۔ کیوں کہ ریاست کسی قاعدے قانون کے تحت سیکڑوں برس سے چل رہی تھی۔ جب کہ ون یونٹ کے افسر روایات سے لاعلم تھے۔ تاہم دور دراز علاقوں میں جلتے صحراؤں میں بجلی پانی نہ ہوتے ہوئے بھی ادارے اور اسکول قائم کرتے چلے گئے۔ وہ نئی نسل تیار کر رہے تھے جو خود نظام چلانے کی اہل ہوتی۔ دالبندین، ناگ، لدگشت، کولواہ، تربت اور جانے کہاں کہاں پہنچ گئے۔ البتہ سی آئی ڈی تنگ کرتی کہ لوگ بلوچی، براہوئی، پشتو بول کر ملک کمزور کرنا چاہتے ہیں، زبانوں کا زہر پھیلا رہے ہیں۔ قومی زبانوں کو مقامی زبانیں قرار دیتے۔ بلوچستانی زبانیں بولنے والوں کو غدار کہتے کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہے۔ قائداعظم کی پیاری زبان۔ جبکہ بلوچستانی 'روس کی شہ پر زبانوں کا زہر پھیلا کر ملک توڑنا چاہتے ہیں۔ لوگ ڈر کے مارے سرکاری دفاتر میں باہم اردو میں بات چیت کرتے۔

مستونگ سے سیٹھ کر عشق تھا۔ اگرچہ بقول اس کے شیو بھگوان کا مندر غائب کر دیا تھا

۔سولا کا مقدس درخت جلا ڈالا تھا۔ مگر پھر بھی مستونگ تو مستونگ ہی تھا، وہ اکثر یہ سطر دہراتا:

"بہ مثل جنت الماوی است مستونگ!"

اس مسکن روح الا میں مستونگ کی بجائے سیٹھ خود تو وہ سنگر میں ہی رہتا مگر اس کی دکان مستونگ میں بھی تھی۔ کار میں چلا آتا اور سہ پہر میں اپنی حویلی کو لوٹ جاتا۔ ڈپٹی کمشنر کو ریاست قلات کے پرانے عہدے ناظم کے نام سے پکارا جاتا۔ یوں تو وہ بے تاج بادشاہ تھا لیکن سیٹھ سے اچھے مراسم تھے۔ سرکاری افسروں کو تاکید تھی کہ علاقے اور اس کے لوگوں کو سمجھیں۔ جس کا واحد ذریعہ وہی پرانے ڈسٹرکٹ گزیٹئرز تھے جو انگریز لکھوا کر چلتے بنے تھے۔ افسروں کو تاکید تھی کہ وہ انگریزوں کے گزیٹئرز غور سے پڑھیں کہ پانچ دس ہزار انگریزوں نے کیسے پورے برصغیر کو غلام بنا رکھا تھا۔ ہماری فوج ہماری پولیس اس نے تیار کی تھی جو اشارے کی منتظر رہتی۔ حکم ملتے ہی اپنے لوگوں کو سنگینوں میں پرو ڈالتے، گولیاں برساتے اور اپنی بوٹوں والی سرکار نے پورے برصغیر کو برما سے کشمیر تک انگریز کا غلام بنائے رکھا۔ کئی بار ہماری موجودگی میں ہی نئے افسر چلے آتے، جو چاہتے کہ سیٹھ پل بھر میں علاقہ کنٹرول کرنے کا طریقہ سمجھا دے۔ وہ سیٹھ سے رواجی قانون کے بارے میں بھی دریافت کرتے۔ جس کے تحت ریاست صدیوں سے کام کرتی رہی۔ یوں تو برطانوی دستور کے مطابق بلوچستان میں تحریری قوانین نہ تھے، بس رواجی قوانین کا ہی احترام کیا جاتا۔ سیٹھ گھما پھرا کر ریاست قلات کے ہی گن گانے لگتا۔ اسے خوف تھا کہ سرکار لوگوں کو باہم بانٹ کے الگ الگ کر کے انھیں کمزور کر دے گی، مذہبی جنون اور فرقہ بندی کو پروان چڑھائے گی۔ نیا کلچر ایک سیلاب کی مانند آئے گا، سبھی کچھ خس و خاشاک کی مانند بہا کر لے جائے گا۔ ریاست قلات کبھی بھی انڈیا کا حصّہ نہ رہی۔ انگریزوں سے بھی آزادانہ معاہدے کے لیے وہ 1876ء اور 1895ء کے معاہدوں کا ذکر کرتا۔ پرشو بلوچ باؤنڈری بھی مقتدرِ اعلیٰ ہونے کے ناطے خان قلات نے خود ہی طے کی تھی کیوں کہ وہ مقتدر اور آزاد حکمران تھا۔

مستونگ بہت اچھا سا قصبہ تھا، سویا سویا سا، باغات کاریزیں اور پرسکون زندگی۔
کچھ کام بھی اتنا نہ تھا۔ جب ہم سنگر (پتھر کا مورچہ) جاتے سیٹھ کے ہاں تو میں بزرگوں کو محوِ گفتگو چھوڑ کر باغوں میں نکل جاتا۔ سیٹھ سات منہ کی رودراکش مالا گلے میں پہن کر بیٹھتا تو پوتر تا شیگوان بھگوان کی شکتی اس پہ اتر آتی۔ عجیب ہی پُر اسراری شخصیت تھی۔ وہ حاضرین کو شکراج سے یسوع مسیح کی ملاقات کا واقعہ بھی سناتا۔ باہر نکل کر والد کہتے کہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے سیٹھ کی باتیں نکال دیا کروں، وگرنہ ان باتوں کو دہرانے سے نقصان کا ہی اندیشہ ہے۔ سیٹھ کبھی چھا جانے کی کوششیں نہ کرتا، مہمانوں کو زیادہ بولنے کا موقع دیتا۔ مجھے اس کی گفتگو بہت اچھی لگتی۔ شام میں درختوں کی بہار، پرندے، لک پاس سے آ کر آماچ سے ٹکرانے والی ہوائیں عجب سماں بن جاتا۔ لیکن سیٹھ کا خوف اس کی باتوں سے ہی جھانکنے لگتا۔ وہ مستونگ کے قریبی شہر اورنگ آباد کا ذکر ہی بھی کرتا، جہاں سے ہندو نقل مکانی پہ مجبور ہوئے تھے۔ وہ ہندوؤں کو سخت غیر محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ یوں تو بزرگوں کی محفل میں زیادہ بیٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر علم سمیٹنے کا ذریعہ سیٹھ ہی تھا۔
''نوکنڈی کا مطلب ہے؛ نوکیں کُنڈی یعنی نو راستے، بگڑ کر نوکنڈی ہوا۔ گھاس پانی کے سبب جسے شہر دل بند یعنی پسندیدہ کہا جاتا تھا، وہ دالبندین ہوا۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ سفر میں نعل بدلنے کی ضرورت پڑتی، جہاں نعل لگانے کا اہتمام تھا، اس لیے اسے نعل بندیں اور پھر دالبندین کہنے لگے۔ نادر شاہ کو بھی محمد شاہ نے پیغام دیا تھا کہ جنگ نہ کرے تو دو کروڑ روپیہ بطور نعل بندی ادا کرے گا۔ کاہ یعنی گھاس اور نوش یعنی پینا بگڑ کر نوشکی بن گیا۔ سیہا بہ معنی کالا ٹیلہ پھر سیندک کا نام اختیار کر گیا۔''
سیٹھ کی باتیں سبھی سنجیدگی سے سنتے اور احترام کرتے۔ مہمان اسے زیادہ بولنے پہ اکساتے بلکہ مجبور کرتے۔ جبکہ میزبان ہونے کے ناطے وہ مہمانوں کو اظہارِ رائے کا کہتا۔ انگریزوں کا سخت مخالفت تھا جو برصغیر کو لوٹ کے چلے گئے۔

”ملک خطّی نے ہمایوں کو باہوٹ بنالیا تھا، ورنہ تو ہندوستان کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ ہمایوں نے بادشاہ بن کر سنگر اور طیری کے معززین کے لیے سوسو اشرفیاں سونے کی بھجوائی تھیں، کیوں کہ غریب الوطنی کے دوران انھوں نے بہت خیال رکھا تھا۔“

سیٹھ نے ہی بتلایا کہ اس کا ہم نام طوطارام 1934ء میں مستونگ سے ’نوشیروان‘ نامی اخبار نکالتا تھا۔ شاید لاہور سے چھپواتا ہوگا۔ بلوچستان میں تو چھاپہ خانہ ہی نہ تھا۔ اور جو ایک تھا بھی اس پہ پابندی تھی کہ صرف سرکاری چیزیں شائع کرے گا۔ اہلِ بلوچستان کی سرکار نے زبان ہی قینچ لی تھی، لکھنے بولنے پہ شدید سزائیں دی جاتیں۔ اسی نے بتلایا تھا کہ خضدار سے ایک سڑک نکال کر اسے کراچی سے ملا دیں گے۔ جس کے باعث سفر آسان ہو جائے گا۔ کسی سوال کے ہی جواب میں سیٹھ نے بتلایا تھا کہ ہندو صبح اور شام کے وقت پانچ سازوں والی نوبت پنج توری بجایا کرتے، قلعہ سے بلند ہونے والی پنج توری کے باعث قلعہ کو ہی پنج توری کا نام دیا، جس نے پیج پور اور پھر پنجگور کا نام اختیار کیا۔

ہندوؤں کی ہزاروں برس قدیم روایات ختم ہو رہی تھیں۔ سرکاری دفاتر چونکہ مستونگ میں تھے، اکثر لوگ اپنے کام کے لیے آیا جایا کرتے، مستونگ میں بڑی چہل پہل رہتی۔ نئے دفاتر بھی بن رہے تھے۔ چوہدری مون لال کی بس غنیمت تھی۔ میں گھر سے پیدل نکل سائنس کالج کے سامنے آ کھڑا ہوتا، وہیں سے بس پہ سوار ہو جاتا۔ واپسی پہ اگلے روز وہیں اتر جایا کرتا۔ ریاست قلات بجائے خود حسین ترین اور متنوع تھی۔ پہاڑ، صحرا، گھاٹیاں، کوہِ ہربوئی اور شاشان جیسے جنگلات، محبت کرنے والے پرخلوص انسان۔ قدیم تہذیبوں کی امین، جہاں ہزاروں برس قبل گبر بند تعمیر کیے گئے تھے۔ آب پاشی کا جدید ترین نظام بھی متعارف کرایا گیا تھا۔

سیٹھ کے خدشات کو بابا فوبیا قرار دیتے ہوئے تاسف کرتے اور سیٹھ کی ذہنی حالت پہ افسوس کرتے جو بلاسبب مملکتِ خداداد اسلامی جمہوریہ سے خوف کھاتا، ریاست قلات

کے درباری کی مانند ماضی میں رہتا ہے۔حال کو ماننے پہ آمادہ ہی نہیں ہوتا۔سیٹھ 1793ء کے جنگجوؤں کو یاد کرتا' جو ریاست قلات سے نکل کر مرہٹوں کے خلاف لڑے تھے۔ریاست بہاولپور کی وزارت موروثی طور پر بلوچوں کے پاس ہی رہتی۔وہ تو خود کو بھی بلوچ ہندو قرار دیتا۔اس پانچ سو برس قدیم ریاست کا وہ واحد قصیدہ خواں یا مرثیہ خواں تھا۔نوشکی کے ہندو بھی اس کی بڑی عزت کرتے،کیوں کہ چند بار ذکر چھڑا تو سبھی اس کے معترف نکلے۔

قلات کی بہت ہی حسین اور دل رُبا یادیں تھیں۔والد نے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر میں نے فرسٹ ڈویژن لی تو مجھے سو روپیہ انعام دیں گے۔میٹرک کا نتیجہ آیا تو کسی کو بتلائے بغیر ہی سائیکل پہ نکل پڑا۔لک پاس پہ سائیکل کو گھسیٹا،بہت چڑھائی تھی۔سہ پہر میں مستونگ پہنچ گیا۔راہ میں بارش نے آلیا،انعام تو ملا،مگر بہت ناراض ہوئے کہ بس میں آجاتے۔سیٹھ کو علم ہوا تو مجھے بلوا کر انعام دیا۔بڑی محبت والا انسان تھا۔بڑا ہی دیالو تھا۔

میں اکثر والد کے ہمراہ ان کے ہاں جایا کرتا۔چند برس بعد والد کا تبادلہ کوئٹہ ہو گیا تو بھی تعلقات اس قدر مستحکم ہو چکے تھے کہ سیٹھ ملنے چلا آتا۔اور کبھی ہم اس کی دعوت پہ جاتے۔جہاں علم و ادب کی باتیں ہوا کرتیں۔انگریز ایک سیکولر ملک چھوڑ کر گئے تھے،مگر بھارت میں برہمن ازم اور ہمارے ہاں ملا ازم کو پروان چڑھایا جا رہا تھا۔سیٹھ کی باتوں میں کہ ہم بدستور غلام رہے ہیں' پہلے تو مجھے یقین نہ ہوتا مگر جب پولیس نے ایک رات اچانک کالج ہاسٹل پہ چھاپہ مارا،اس قدر لاؤلشکر تھا جیسے لال قلعہ پہ حملے کی تیاری ہو۔ہاسٹل کے وارڈن یا پرنسپل کے ذریعے تلاشی لی جاسکتی تھی،مگر طلبا پہ حملہء عام ہوا۔ظریف خان نے غصے میں آ کر ڈپٹی کمشنر جمشید برکی کی جانب پتھر پھینکا،جواباً ظریف پہ گولی چلائی گئی۔وہ شہید ہوا تو پولیس ہاسٹل میں گھس گئی۔طلبا کیا مزاحمت کرتے۔کچھ کود کر پٹیل روڑ کی جانب نکل گئے۔رحمت بلوچ میرے گھر دوڑا ایا چلا آیا۔جلدی سے اسے چھپایا۔سپاہی نے اس کی گردن پہ بٹ مارنا چاہا تھا۔وہ جھکائی دے کر نکل گیا،ورنہ وہیں مارا جاتا۔

طلبا کو پکڑ نے گرفتار کرنے کی رسم چل نکلی تھی ، جو کوئی بولتا تو بھارتی یا روسی ایجنٹ یا کافر قرار پاتا۔ بھٹو نے طلبا لیڈروں پہ نیا قہر توڑا، جس کا ذکر انگریزوں کے دور میں سنا تھا کہ طلبا کو جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ بھٹو کو جرنیل بننے کا شوق تھا، وردی بھی ویسی ہی پہنتا۔ بلوچستان پر حملہ کر کے اسے فتح کرنے میں بھی کامیاب ہوا لیکن اسے جرنیلی راس نہ آئی۔ استعفیٰ پر دستخط کرنے سے انکار کیا تو ٹھوکریں مار مار کر مردہ جسم تارا مسیح کے حوالے کر دیا۔

سیٹھ کی باتیں جسے میں کبھی مجذوب کی بڑ سمجھتا' اب حقیقت کے قریب ہی محسوس ہونے لگی تھیں۔ میرے کئی دوست قلی کیمپ لے جائے گئے۔ شاہی قلعہ لاہور کا عقوبت خانہ بھی وطن دوست انسانوں کا مہمان خانہ بنا۔ ہر جانب غربت، افلاس، مایوسی، خوف اور سیاہی پھیل گئے۔ قاشم کی طرح سپاہی خود ہی زمین سے اُگ اُگ کر باہر آتے چلے گئے۔ سریاب پھر تھانہ سونا خان ، لک پاس کی چڑھائی، پھر نوشکی موڑ' غرضیکہ لنڈی (منڈی رنگ کا زہریلا سانپ) کی طرح اتنے سپاہی زمین سے نکل آئے کہ ہم انہیں برآمد کر کے زرِمبادلہ بھی کما سکتے تھے۔ انھی دنوں شناختی کارڈ کی باتیں ہونے لگیں کہ ہر شہری کا ایک قومی شناختی کارڈ ہوگا۔

مستونگ اور سنگر نے بہت ہی تاریخ ساز شخصیات سے ملنے کا اعزاز بخشا۔ سردار محمد زمان محمد شہی ، نواب عبدالقادر شہوانی ، بابو عبدالرحمان کرد ، میر عبدالواحد کرد ، زمرد حسین قلات پبلشر والے ، سردار بہادر خان بنگلزئی ، میر عبدالعزیز کرد ، ملک فیض محمد یوسف زئی ، ملک عبدالصمد خواجہ خیل ، ملک محمد سعید دہوار اور میرے دوست ملک سیف الدین۔ اس زمانے میں خبروں پہ اس قدر پابندی تھی اور لاعلمی کا یہ عالم تھا کہ میر عبدالواحد کرد سات برس بعد رہا ہو کر کوئٹہ میں شیر محمد مری کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ چند لوگ تپاک سے ملے اور دریافت کیا کہاں رہے، بہت دنوں بعد ملاقات ہو رہی ہے۔ شیر محمد مری نے ایک آہ سرد کھینچی کہ اے قوم! افسوس جو لیڈر سات برس تمہارے لیے جیل میں رہا، تم کہتے ہو کہاں رہے۔

سردار عطاءاللہ مینگل وزیر اعلیٰ کا مستونگ روڈ پہ جلسہ ہوا تو مکھی سودھر داس نے

تقریب کی۔ ابتدائی تلاوت کی اور ترجمہ پیش کیا۔ دوقومی نظریہ کا ڈھول چی، لوڑی یہاں سر نہ نکال سکا۔ 13 نومبر 1839ء میں جب برٹش آرمی قلات پہ حملہ آور ہوئی تو ہندو بھی ہتھیار لے کر میری میں مورچہ بند ہو گئے۔ خان نے روکا اور مشورہ دیا کہ کچھ دیر کے لیے قلات سے چلے جائیں۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا کہ ہم بلوچستانی ہیں، پیچھے ہٹے تو تاریخ کو کیا منہ دکھائیں گے۔ دیوان بچل مل بھی اپنے بیٹوں کے ہمراہ دست بدست لڑائی میں جان پر کھیل گیا۔

مگر حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ امریکہ دھڑا دھڑ ڈالر چھاپ کے پھینک رہا تھا۔ کوئٹہ، سرانان میں ڈالروں کے اسٹور تھے، جہاں بنڈل کے بنڈل ڈالر بانٹے جاتے۔ جنگجو دھڑ سے کوئٹہ کے کرنسی ڈیلروں سے پاکستانی نوٹ لیتے۔ دولت کا سیلاب آ گیا۔ سعودی بادشاہ روحانیت کا پیکر مجسم بھی جہاد کے نعرے لگا رہا تھا۔ بلوچستان میں Mass Hysterion پھیل گیا۔ کلاشنکوف پندرہ ہزار میں اور اس کی گولی ستر پیسے میں ملنے لگی۔ ہر طرف جہاد کے نعرے تھے۔ ایسے نعرے میرے دادا ابراہیم لودھی کے خلاف بابر نے بھی لگائے تھے اور دارا شکوہ کے خلاف اورنگ زیب نے بھی لگوائے تھے۔ سیٹھ طوطارام کی آبائی زمینوں ہی قبضہ ہونے لگا۔ ان افغان بھگوڑوں کو سرکاری مجاہدین کہتے تھے۔ طوطارام کے بیٹے نے مقابلہ کیا تو اسے قتل کر ڈالا۔ قاتل نے گھر جا کر اپنی پچپن سالہ بیوی کو بھی قتل کر کے سیاہ کاری کا کیس بنا دیا۔ سرکار بالکل ہی لاتعلق ہو گئی۔ بلکہ جلوس نکلنے لگے کہ قاتل کی بیوی سیٹھ کے بیٹے کے سبب ماری گئی، لہٰذا سیٹھ اپنی بیٹی قاتل کو دے کر اس کا نقصان پورا کرے۔

بہت ہی سخت دن تھے۔

ایک بار میں سیٹھ کی خیریت پوچھنے نکلا تو بلوائیوں نے مجھے روک لیا کہ میرا کیا تعلق ہے؟ میں نے بڑے ہی حیلے سے جان بخشی کرائی اور پلٹ آیا۔ ہندو بڑی تعداد میں نقل مکانی کر رہے تھے۔ سیٹھ جو قابوس کے پنجے میں رہتا، اس کے خدشات بھیانک رخ اختیار کر چکے تھے۔ افغانستان میں دراندازی کے سبب ایک جنون سا پھیلا جا رہا تھا۔ والڈ نیوٹن کے قانون

سے بھی خائف تھے کہ ہر عمل کا ردِ عمل ہوا کرتا ہے۔ انہیں خوف تھا کہ جو آگ ہم افغانستان میں لگا رہے ہیں، بھڑک کر ہمیں ہی لپیٹ لے گی بھسم کر دے گی۔ پورا ماحول تیزی سے بدل رہا تھا، بدلا جا رہا تھا۔ ہم کوئی ہنومان نہیں کہ اپنی دُم سے لنکا جلا کر خود زندہ نکل لیں۔ ہر کوئی لنکا جلا کر نکل نہیں سکتا۔ والد چاہتے تھے کہ اس آفت زدہ علاقے سے جسے بلوچستان کہا جاتا ہے، میں نکل جاؤں۔ انگریز بہادر اس خطّے کو Hostile Land قرار دے گئے تھے۔ اب تک اسے آسمانی صحیفے کی مانند سینے سے لگا رکھا تھا۔

میں بھی مرکزی حکومت میں جا شامل ہوا۔ پاکستان بھر میں کہیں پکڑ دھکڑ نہ تھی اور نہ ہی فورٹ منرو والی بارڈر پولیس جو بلوچستانیوں کو غیر ملکی سمجھ کر تلاشیاں لیتی۔ نہ چیک پوسٹ نہ کوئی زنجیر۔ اچانک ہی میرا درجہ ایک باعزت شہری سا ہوگیا۔ بلوچستان نے semi nomadic سوسائٹی سے کمرشل سوسائٹی میں اتنی بڑی چھلانگ ماری کہ اس کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ نیم جان سا ایف سی کی گود میں جا گرا۔ چوہدری موہن لال کی ریں ریں کرتی بسوں کی بجائے اب فراٹے بھرتے کوچ آچکے تھے۔ مگر میں تو جہاز میں آتا جاتا رہا۔ کیوں کہ بسوں کو روک کر شناختی کارڈ دیکھتے اور پھر ہزارہ یا آباد کاروں کو الگ کر کے گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔ بلوچوں کی مسخ شدہ لاشیں ویرانوں سے ملتیں۔

سرکار نے یہ لکن میٹی ختم کی، امن کرا دیا۔ تو لوگ باگ دوبارہ بسوں میں آنے جانے لگے۔ پی آئی اے مہنگا بھی تھا اور اس کے نشئی جعلی لائسنس والے پائلٹ جہاز بھی گرا دیا کرتے۔

میری اُن دنوں کراچی تعیناتی تھی۔ سوچا کہ جب تک سرکار دوبارہ ہنگامے کرائے، جیپ میں ہی نکل جاؤں۔ صدیوں بعد اندرون بلوچستان کی زیارت کروں۔ سڑکوں پہ جگہ جگہ ایف سی کے جوان چیک پوسٹ سجائے اسپیڈ بریکر لگائے کھڑے تھے۔ یہ بڑے بڑے سے اسپیڈ بریکر، جیسے امن کی بڑی بڑی قبریں جن کے سجادہ نشین اور متولی سپاہی تھے۔ چراگی بھی

وصول کرتے، تلاشیاں بھی لیتے، پکڑ دھکڑ بھی ہوتی۔ مگر امن ہوگیا تھا۔ سڑکیں محفوظ تھیں۔

کھڈ کوچہ کے آتے ہی دل میں سیٹھ کی یاد ابھر آئی۔ اب میں افسر تھا، باوردی ڈرائیور اور گارڈ والا۔ سنگر کے پاس سیٹھ کی حویلی کی جانب جیپ رکتے ہی مسلح افراد باہر نکل آئے اور مجھ سے تعارف چاہا۔

میں نے بتلایا کہ سیٹھ کی خیریت دریافت کرنے آیا ہوں۔

انہوں نے مجھے بتلایا کہ سیٹھ غدار تھا، چھپ چھپاتے جانے کہاں کھسک گیا۔ صبح ہوئی تو حویلی خالی تھی۔ برسوں گزر گئے، وہ کبھی کہیں بھی دکھائی نہ دیا۔

وقت سائیں سائیں کرنے لگا۔

"اب یہ حویلی کس کی ہے؟"

انھوں نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ ایک بزرگ مسکرایا۔

"آپ افسر ہو کر بھی نہیں جانتے کہ شُوم کا مال غازی کھاتا ہے۔"

گدھے کی واپسی

حالات نے خدا بخش کو خدو بنا دیا تھا۔ گدھا گاڑیاں تیزی سے مہر و وفا کی طرح ختم ہوئی جاتی تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ دیبا کی گلیوں سے نکلتے ہی کام مل جاتا۔ مگر چھوٹی گاڑیاں اور رکشے جانے کہاں سے چلے آئے تھے، دھواں اگلتے بھونپو رُوں رُوں رَیں رَیں کر کے چلتے اور پل بھر میں منزل تک مال پہنچا آتے۔ نہ چابک اور نہ گدھے کے لیے پانی تلاش کرنا ہوتا۔ بڑی سہولت میں رہتے۔ گرمی سردی بھی بچاؤ رہتا۔

ہر شام وہ گھاسلیٹ اور روٹیاں لیے گھر پہنچتا تو سالن کی مہک اس کی بیوی نازو کی طرح استقبال کرتی۔ روٹیاں بھی مہنگی ہو چکی تھیں۔ پہلے تو ایک روپے کی دس روٹیاں آتیں، پھر روٹی ایک شاہی (دوّنی) کی ہو گی۔ روٹی مہنگی اور انسان سستے ہوئے جاتے تھے۔ ٹال والوں نے بھی منہ موڑ لیا، سوزوکیاں لگالیں۔ خدو تنگ آ کر جیل روڑ پہ گدھا گاڑی لے آتا کہ اس چہل پہل میں اسے کام مل جائے۔ چھاؤنی گدھا لے جانے پہ پابندی تو تھی ہی پھر جناح روڑ لیاقت بازار میں بھی پابندی لگ گئی تو امکانات محدود ہوتے چلے گئے۔ کھدائی کرنے والے بھی گاڑیاں ہی منگوالیا کرتے۔ گاڑی کو کام نہ بھی ملے تو اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے، گھاس پانی کچھ نہیں مانگتی۔ جب کہ کام نہ ملنے پر بھی گدھے کو تو چارہ دینا ہی ہوتا ہے۔ خدو کو یوں لگتا کہ

اس کا پیٹ بھی گدھا ہے، یا اسے گدھے کا پیٹ لگا ہے۔ جیسے مرد کا حصہ گدھے کو دے دیا گیا۔ حالاں کہ مرد تو اشرف المخلوقات ہے۔ مگر گدھے کے مقابل مرد کا شرف سمٹ کے رہ گیا۔

زندگی خرینگڑی کی طرح تلخ ہوئی جاتی تھی۔

نازو ایک صابرہ و شاکرہ بیوی تھی۔ روکھی سوکھی کھا کر بھی اللہ کا شکر ادا کرتی بلکہ خدو کو بھی حوصلہ دلاتی کہ سختی کے دن گزر ہی جائیں گے۔ خدو یوں تو محنتی تھا، کام سے مشقت سے نہ گھبراتا، بوریاں یوں پھولوں کی طرح اٹھا کر خر گاڑی پہ لاد کر ٹخ ٹخ کرتا نکل جاتا۔ منزل پہ پہنچ کر یوں پھرتی سے بوریاں کمر پہ لاد لاد کر اندر رکھ آتا کہ لوگ خوش ہو جایا کرتے۔ گدھا گاڑی کے نیچے بالٹی بھی جھومتی رہتی۔ وہ گدھے کے لیے پانی مانگتا، اسے پانی پلا کر نئے کام کی تلاش میں نکل جاتا۔ شہر پر تو مشینوں کا قبضہ ہوا جاتا تھا۔ جانے کون سا نادر چم کش تانگے اور گدھا گاڑیاں کھائے جا رہا تھا۔ لوسن بھی مہنگا ہوا جاتا تھا، روٹی بھی۔ انسان اور گدھے دونوں ہی بہت پریشان تھے۔ خدو تو جانتا تھا کہ مالک اس کا امتحان لے رہا ہے۔ اسے کچھ ایسے گناہوں کی سزا مل رہی ہے، جس کا اسے کچھ علم نہ تھا۔ جب اسے جنت کی دلفریبیاں سنائی جاتیں تو دعا مانگتا کہ روٹیوں کا ایک لوڑا اس پہ آن گرے۔ اس کے گھر پہ برس جائے، جانے آسمان سے بارش اولے ہی کیوں برستے ہیں، روٹیاں کیوں نہیں گرتیں؟ گرم گرم، خمیری، پتیری، گھر میں پیدا ان ہو کوبلی ہو بس کھانے کو ہی بہت کچھ ہو۔

خدو تو صاحب ایمان تھا، جانتا تھا کہ مالک اس کا امتحان لے رہا ہے۔ جانے کون سا امتحان؟ سہ ماہی، ششماہی یا کہ سالانہ۔ حالاں کہ اس نے کبھی امتحان کا داخلہ فارم تک نہ بھرا تھا۔ جس کے بعد خر گاڑی کو کام مل جائے گا۔ بس روٹیاں ہوں گی اور وہ ہوگا۔ پھر وہ گدھے کو بھی خمیری روٹیاں کھلا سکے گا۔ اناج میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے، روٹیاں کھا کر تو گدھا خوب زور لگائے گا۔ سڑکوں پہ دوڑتا بھاگتا اڑتا چلا جائے گا۔ مگر گدھا تو تھا ہی گدھا، وہ سمجھتا تھا کہ خدو اسے کم کھانے کو دے رہا ہے۔ وہ اپنی ویران آنکھوں سے خدو کو دیکھتا، اس کی آنکھوں میں

فریاد ہوتی گڑانک سی! وہ تھوتھنی اُٹھا کر خدو کو دیکھتا سر مارتا۔ یوں بیچارگی سے بلبلاتا کہ خدو کا دل بھر آتا۔ اس نے بارہا گدھے کا سر ساتھ لگالیا، "میں تجھ پہ ظلم نہیں کر رہا، مگر کیا کروں، مالک ہمارا امتحان لے رہا ہے۔" وہ سوچتا اس کا امتحان تو لے رہا ہے مگر گدھے کا امتحان کیوں لے رہا ہے۔ گدھا کون سا گناہ کرتا ہے۔ اس گدھے پہ تو قانون بھی لاگو نہیں ہوتا، ختنہ بھی نہیں ہوتا۔ جیسے چاہے لید کرے، دُم مارے۔ وہ کون سا گناہ کرتا ہے۔ بھوک سے گدھا بے حال ہوا جاتا تھا، اس کی ہڈیاں نکل آئیں۔ اب وہ دوڑنے کی بجائے کسی سرکاری طرح سڑکوں پہ ڈگمگاتا چلتا۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی خدو اسے چابک مارتا، کیوں کہ گاہک اصرار کرتا کہ مال جلدی پہنچایا جائے۔ کچھ گاہک تو کُرکُر بھی کرتے کہ اتنے میں تو وہ پیدل بھی مال پہنچا سکتے تھے، "اتار دو سڑک پہ" کچھ بکنے جھکنے پہ آجائے "سوزوکی منگوالیتا ہوں"۔ خدو اپنا غصہ گدھے پہ نکالتا اور چابک مارنے لگتا جس سے گدھے کی پشت پہ لمبے لمبے سے زخم بن گئے۔ جن پہ مکھیاں بھنبھنانے لگتیں تو گدھا بیکل ہو جاتا۔

گدھا اس قدر کمزور و ناتوان ہو چکا تھا کہ ایک بار چڑھائی چڑھتے ہوئے بوجھ نہ سہا رسکا اور ہوا میں اٹھتا چلا گیا۔ خدو نے اپنا وزن بھی ڈالا مگر گدھا گاڑی سیدھی نہ ہو سکی۔ گدھا ہوا میں معلق ہو گیا اور گاڑی نوے ڈگری پہ آگئی۔ چونکہ بوریاں باندھ رکھی تھیں، بوریاں نہ گریں۔ خدو ایک تماشا بن گیا۔ بچے اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔ کچھ رحم دل آگے بڑھے، اپنا وزن ڈال ڈال کر گدھا گاڑی کو سیدھا کیا۔ خدو کو بھی گُرکی دی کہ وہ اتنا وزن بے زبان پہ کیوں ڈالتا ہے۔ خدو کو لگا کہ وہ بھی ایک گدھا ہے اور زندگی کی گاڑی لیے نتھا سنگھ اسٹریٹ پہ چلا جاتا ہے۔ مگر اسے وزن کے حساب سے فی بوری کرایہ ملتا تھا۔ وہ گدھے پہ ترس کھاتا تو اسے کھانے کو کچھ نہ ملتا۔ اسے لگتا کہ اس کا دل تو رحم دل ہے مگر پیٹ ظالم ہے، پیٹ میں بھوک سے آگ سی لگتی جسم کاغذ کا بنتا تو اس کی نیکی ہوا ہوتی۔ سوچتا کہ گدھے کو ہی بیچ ڈالے۔ ایسا کمزور گدھا، لاغر، ناتواں، زخمی، بے حال، مسلمان ملکوں کے عوام سا کہ کوئی خریدنے پر آمادہ نہ ہوا۔ البتہ گاڑی

اچھی قیمت پہ بک گئی۔ پورا ایک بوری آٹا اور جری کین گھاسلیٹ کا بھی خرید لایا۔ گدھا تو چلنے سے بھی عاجز تھا، وہ اسے جیسے تیسے باہر لے آیا۔

گدھے کو رخصت ہوتے دیکھ کر نازو کا دل بھر آیا۔

"تم نے بہت دن ہمیں روزی روٹی دلائی، ہم کیا کریں مجبور ہیں، ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں، ورنہ کبھی تمہیں خود سے جدا نہ کرتے"۔

پلو آنکھوں پہ رکھ کر وہ آنسو بہاتی اندر چلی گئی۔

گدھا گھر میں مرتا تو الگ سے خرچہ ہوتا اٹھوانے کا۔ وہ اس کے گلے میں رسی باندھ کر کشاں کشاں لیے چلا۔ رات کے اندھیرے میں وہ گدھے سے آنکھ ملانے سے بچا رہا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ آسمان پہ ایک بھوکا چاند سائیکلوپس کی سی آنکھ نکالے شہر کو تکے جا رہا تھا۔ جہاں دو قومی والی دو قومیں رہتیں تھیں؛ بھوکے پیٹ والی قوم، بھرے پیٹ کے اپھارے والی قوم۔ گدھا یوں تو چلنے سے عاری تھا، مگر خدو اُسے کھینچتے گھسٹتے جا رہا تھا۔

دُور بہت دُور، جیل روڑ پہ گدھا ڈگمگا سا گیا۔ خدو نے اسے کوئنہ ایش کے درخت کے ساتھ لگا دیا۔

"مجھے معاف کر دینا سنگت، میں تمہاری موت نہیں دیکھ سکتا"۔

واپسی پہ نازو نے اسے دکھی آنکھوں سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو "چھوڑ آئے اسے"۔

معروف پارسی منوچہر کیکو باد مار کر کو عرف عام میں مینو مار کر کہا جاتا تھا۔ مینو مار کر صبح اپنی فیکٹری مار کر ایلکو لائیٹرز میں آیا تو دیکھا کہ گیٹ کے مخالف رخ پہ ایک زخمی گدھا سر جھکائے بیٹھا ہے۔ جاں بلب سا لگا۔ جیسے دھونکنی بند ہونے کو ہے۔ مینو چونکا۔ اس نے فوراً کار رکوائی اور نیچے اتر آیا۔ "یہ کس ظالم نے اسے زخمی کیا"۔ وہ احتجاج پہ اتر آیا۔ مینو مار کر کو گدھے کے پاس کھڑا دیکھ کر سیکورٹی گارڈز، مینیجر، سپروائیزر بھی دوڑ پڑے۔ فوراً گدھے کے لیے لوسن منگوا لیا گیا۔ اسے کھانے پینے کو دیا گیا۔ سبھی نے زور لگا کر گدھے کو اٹھایا۔ اپنے طور پر گدھا کسی سول

حکومت کی طرح لڑکھڑاتے انداز میں رینگتا فیکٹری کے باغ میں آ گیا۔ مینو مار کر نے فوراً ڈنگر ڈاکٹر بلوا بھیجا۔ جس نے گدھے کی کمر پہ دوا بھی لگا دی اور تشخیص کی کہ اس کا مرض بھوک ہے، اور کچھ نہیں۔ مینو مار کر نے تھانے فون کیا کہ پتہ چلایا جائے کہ اس گدھے کا مالک کون ظالم ہے، تاکہ وہ اسے قانون کے مطابق سزا دلوا سکے۔ اس نے سکیورٹی گارڈز کو بھی ہدایت کی کہ اگر اس گدھے کا مالک آئے تو فوراً اس کی گردن ناپ کر قابو کر لیا جائے۔ علاج اور اچھا سلوک اس پہ بڑھیا لوسن چوکر گدھا دو ہی ماہ میں موٹا تازہ ہو گیا۔

ایک روز معمول کا کام جاری تھا کہ فیکٹری ڈھینچوں ڈھینچوں کے شور سے گونج اٹھی گدھا دوڑ کر ایک کمزور مرد سے جا لگا جو فیکٹری میں کام ڈھونڈھنے آیا تھا۔ اِدھر تو گدھے کی یہ دیوانگی اُدھر وہ مزدور گدھے کے گلے میں باہیں ڈالے لپٹ سا گیا۔ بہت سے لوگ دوڑ آئے۔

"یہ میرا گدھا ہے" نووارد خوشی سے چلا اٹھا۔

سیکورٹی گارڈز نے اسے کس لیا۔

شور اور ہنگامہ سن کر مینو مار کر کو تعجب ہوا۔

اتنے میں مینیجر دوڑا چلا آیا "سر ہم نے گدھے کا مالک پکڑ لیا ہے۔"

مینو کار کر غصے میں باہر نکلا اور باغ میں چلا آیا۔

"ظالم انسان! تم ہو اس گدھے کے مالک؟ کون ہو تم۔"

نووارد ڈرا سہما سا تھا۔

"میں خدا بخش ہوں لوگ مجھے خدو کہتے ہیں۔ میں تو آپ کی فیکٹری میں کام ڈھونڈنے آیا تھا مگر گدھا پہچان گیا۔"

"تم نے اس بے زبان پہ ظلم کیا، مارا پیٹا، بھوکا رکھا۔ اس کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ اب میں تمہیں جیل ڈلواؤں گا تاکہ تم کسی جانور پہ ظلم نہ کرسکو۔"

خدو بھونچکا رہ گیا۔ وہ فاقہ کشی سے بے جان سا ہو چکا تھا۔ کانپ سا گیا۔
''میں نے ظلم نہیں کیا۔ میرا امتحان لیتے لیتے قدرت میرے گدھے کا بھی امتحان لینے لگی، یہ دیکھیں میری ہڈیاں اس گدھے سے زیادہ نکل آئی ہیں۔ میں ظالم نہیں، رحم دل ہوں۔ اسے خالی سڑک پہ چھوڑ آیا کہ اپنی آنکھوں سے مرتا نہ دیکھوں اور نہ ہی اسے بھوک سے بلکتا دیکھوں۔''
مینو کا دل پسیج گیا۔ اس کا چہرہ دوبارہ پرسکون سا ہو گیا۔
''اچھا اسے لے جاؤ، مگر ظلم نہ کرنا، بھوکا نہ رکھنا۔''
خدو بدستور ڈرا سہما تھا۔ تاہم جھجکتے ہوئے فریاد کی۔ ''آپ کو گدھے کا خیال ہے، گدھے کے مالک کا نہیں۔ میں بھی بھوکا ہوں، میرا گھر بھی بھوکا ہے۔ نیاڑی بھی بھوکی ہے۔''
مینو کا غصہ جاتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ وہی محبت بھرا سکون لوٹ آیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سے مسکراہٹ بھی جل اٹھی۔
''اچھا یہ گدھا گھر لے جاؤ، آج سے تم فیکٹری کے ملازم ہو۔ اومان کی جھاڑیاں بھی توڑ توڑ کر تم اسی گدھا گاڑی پہ لایا کرنا۔ اس کا الگ سے کرایہ ملے گا''۔
سارا اسٹاف اس ہمدردی پہ جھوم اٹھا۔
خدو کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
وہ اعلیٰ نمبروں سے امتحان میں پاس ہو چکا تھا۔ قدرت نے رزلٹ کارڈ تھما دیا تھا۔
مینو مڑ کے مینیجر سے مخاطب ہوا۔
''اسے گدھا گاڑی خریدنے کے لیے رقم اور ایک ماہ کی تنخواہ اعزازی دے دو۔''
خدو کے ہوش اڑ گئے۔ وہ مزدوری ڈھونڈنے آیا تھا اور شاہی مل گئی۔ وہ مبہوت رہ گیا کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔
''جاؤ'' مینو نے شفقت سے ڈانٹا ''تمہارے گھر والے بھی گدھے کے لیے اداس

کوہلی — مٹی کا تنور سا گندم رکھنے کے لیے

گدھے کی واپسی — مرشدی کرشن چندر نے اس حوالے سے تین ناول لکھے

ہوں گے۔اپنا گدھا واپس لے جاؤ۔"

خرینگڑی	حقل، تمہ
چم کش	آنکھیں نکلوانے والا۔نادر شاہ افشار۔مجاز آ ظالم
لوڑ	بگولہ
گڑانگ	ویرانہ
گرگر کرنا	بڑبڑانا۔جھینکنا
نیاڑی	خاتون
اومان	قدرتی بوٹی جس سے الفیڈ رین بنتی ہے
امپان	چمڑے کا مشک ایک من آٹے کا

کاما سُوترا

حمید ریٹائر ہو کر کوئٹہ چلا آیا۔ یہ پشتو نام کوٹہ یعنی قلعہ سے بنا تھا، مگر تھا جوں کا توں قلعہ نما۔ جس میں رواداری، حلیمی، وسیع النظری داخل نہیں ہو سکتی تھی۔ ٹوٹا پھوٹا تباہ حال شہر جہاں یہ بڑے بڑے پلازے بن چکے تھے۔ جیسے قدیم کافر مینار بنا کر خدا کو دیکھنا چاہتے تھے۔ شہر پانی کے لیے جاں بلب تھا۔ کئی حصوں میں منقسم تھا۔ لاہور میں تو 27 کلو میٹر ٹرین تین سو ارب سے بنی تھی جبکہ یہاں ٹوٹی ہوئی سڑکوں کا جال بچھا تھا اور قدم قدم پہ تلاشیاں لیتے سپاہی، جن کی آنکھوں میں جانے کون سا لیزر فٹ تھا کہ محض گھور کر دیکھنے سے ہی محب وطن کو تاڑ لیتے۔ جاپان میں یہ سب کچھ نہ تھا، نہ ہی جاپانی اس قدر بزدل تھے کہ لسانی قبائلی ڈھال لیے پھرتے، جس کے بنا وہ مارے کچلے جاتے، وقت انہیں روند کر نکل جاتا۔ یہاں تو مردانہ کمزوری کے اشتہاروں کے ساتھ ساتھ وال چاکنگ تھی؛ ''بلوچستان کو میرٹ کی لعنت سے آزاد کرو''۔

دوستوں نے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیا، اب مرحلہ تھا رہنے کا، شہر میں فقیر ٹوٹی سڑکیں، پانی کے کی تنگی، جھگڑے، سیاسی جلسے، دنگے فساد تھے جبکہ اس گنجے شہر کے ساتھ ہی شداد کی جنت تھی۔ اس شنگریلا میں درخت لہراتے، سبزہ لہلاتا، پانی کی فراوانی تھی۔ داخلے کے صرف چھ

گیٹ تھے جہاں ہزار روپیہ ادا کر کے کینٹ انٹری پاس ملتا۔ سال بھر چلتا اور پھر اگلے برس پولیس اور جانے کہاں کہاں سے تصدیق کروا کے نیا کارڈ لینا ہوتا۔ موٹر سائیکل، پیدل غرضیکہ سبھی کو رقم بھرنا ہوتی۔

حمید خاصا بگڑا کہ شہریوں پر اٹیشن کمانڈر کیسے ٹیکس لگا سکتا ہے، یہ کام تو بلوچستان اسمبلی کا ہے۔ دوستوں نے دلاسہ دیا کہ یہ قانون وانون جاپان میں چلتا ہے، یہاں نہیں چلنے کا، یہاں طاقتور کی مرضی کو ہی قانون کہتے ہیں۔ حمید کو یوں لگا کہ بس اچانک ہی وہ انسان سے لیاری کی گدھا گاڑی کا گدھا بن گیا ہے، چاہے لاکھ دولیتاں جھاڑے چھٹکارہ نہیں ملنے کا۔ کینٹ کے مکان بہت ہی مہنگے تھے۔ جیسے تیسے اس نے مجاہد کالونی میں ایک چھوٹا سا بنگلہ خرید ہی لیا۔ یہ کالونی بھی محفوظ تھی۔ اکثر دشمن دار بھی وہیں رہتے۔ کیوں کہ ان پہ حملے کا امکان ہی نہ تھا۔ حمید تو ساٹھ برس میں بھی خاصا سمارٹ تھا۔ کالونی والوں سے میل جول ہوا۔ پی آر بڑھانے کے لیے مغرب کی نماز میں ضرور کالونی کی مسجد میں جایا کرتا۔ تاکہ دین دار مشہور ہو اور یہ بھی ثبوت رہے کہ اکثریتی فقہہ ہی سے ہے، ورنہ تو دوسرے فقہے کا سمجھ کر کوئی گولی مار کے نکل لیتا۔

حمید کا قبیلہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے علاقے میں چلا آئے، عزت بھی ملے گی اور تحفظ بھی۔ یوں وہ اپنی دولت سے قبیلے کو فائدہ پہنچا سکتا تھا، نوکریاں خرید خرید کر بہت سے جوانوں کو بر سر روزگار بھی کر سکتا تھا۔ حمید قبائلیت کے خلاف تھا۔ قبائلی اپنے قبیلے کا وفادار ہوا کرتا ہے نہ کہ وطن کا۔ جبکہ وہ پاکستانیت کا پرچارک تھا۔ قبائلیت تو پاکستانیت کی دشمن ہے۔ حمید ایک سچا اور کھرا پاکستانی تھا۔ وہ علاقے سے دور رہی رہا۔

بنیادی طور پہ وہ تنہائی پسند تھا۔ جو بھی پیار سے ملی، اسی کے ساتھ ہو لیا۔ جہاں چھوٹی پٹری ملی ٹریک بدل کر مڑ گیا۔ دنیا کو مسافر خانہ قرار دیتے ہوئے وہ بیوی کی گٹھڑی سر پہ اٹھائے پھرنے کے خلاف تھا۔ مرد اکیلا آتا ہے، اکیلا ہی جاتا ہے۔ ورنہ تو بیوی اس کی پسلی سے نکل آتی، اس کا ہمزاد بنے رہتی۔ بیوی بھی بے وردی سپاہی سے کیا کم ہوا کرتی ہے۔

حمید کو اس کے ملک معتبر بھی مدعو کیا کرتے تو ایسے میں اسے تکریم ملتی۔ میپن ژرہ (سفید داڑھی) کے ساتھ بٹھاتے، پہلے ہاتھوں دھلوانے کا اعزاز بھی ملتا، معتبرین میں بھی شامل رہتا۔ اس نے آبائی گھر میں بھی چند ہی بڑی دعوتیں بھی دیں تا کہ سبھی سے میل ملاقات اور ارتباط رہے۔

دو ہفتے بعد ہی کالونی ہل کے رہ گئی۔

یوں تو آتشیں اسلحہ لانے پہ پابندی تھی مگر ایک قتالہ جو کسی ایٹم بم سی جان لیوا تھی، اس کے گھر میں دیکھی گئی۔ نوجوانوں نے سب سے پہلے یہ خبر پھیلائی۔ یوں لگتا تھا جیسے ٹرائے سے ہیلن ہزار روپے والا کینٹ انٹری پاس بنوا کر چلی آئی ہو۔ نوجوان، حمید کے گھر والا راستہ اختیار کرتے۔ کوئی واک کرتا چلا آتا، کسی کا گیند لان میں آ گرتا۔ اچانک ہی حمید کی مقبولیت بڑھ گئی۔ نمازِ مغرب میں اس کے دائیں بائیں صف میں کھڑے ہونے کے لیے تگ و دو اور سفارش چلنے لگی۔ بہت سے نوجوان جاپان جانے کا عندیہ دیتے ہوئے حمید سے جاپانی زندگی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگے۔ حیرت کی بات تھی کہ اس دشمن ایمان کا نام پونم تھا۔ وہ دکھائی بھی پونم ہی دیتی۔ لوگوں کو ہچکچاہٹ بھی ہوتی کہ کیسے اور کیوں کر پوچھیں کہ اس کا حمید سے رشتہ کیا ہے یا کہ روس سے خریدی گئی کوئی کنیز ہے۔ کیوں کہ جس طرح حمید پونم کو مخاطب کرتا، کسی خادمہ ہی کو مخاطب کیا جا سکتا ہے۔ بعض خواتین کو بھی بھجوایا گیا کہ جا کر دیکھیں کیسی ہے، آیا بہو بنائی جا سکتی ہے۔ پونم اخلاق سے پیش آتی مگر لینے یا رخصت کرنے باہر نہ جاتی۔ سالگرہ یا کھانے پہ بلایا جاتا تو بھی معذرت کر لیتی۔ اس کے چہرے پہ جان آف آرک والی ملکوتی تقدیس برستی۔ بڑے سے بڑا دل پھینک اسے حالِ دل سنانے، زخمِ جگر دکھانے کی ہمت نہ کر پاتا۔ مہمانوں کے اصرار پہ وہ صوفے پہ آ کے بیٹھ جاتی، ملازم چائے خود سامنے رکھتا، پونم محض مسکراتی یا پھر خود ہی شکر ملا دیتی۔ خود چائے نہ پیتی اور ادب سے کہتی، ''جی میں روزے سے ہوں''۔ کالونی حیران تھی کہ داؤدی روزے بھی ایک دن کے ناغے سے رکھے جاتے ہیں

۔ جبکہ وہ مسلسل روزے سے رہتی۔ اس کے باوجود عام لڑکیوں سے زیادہ صحت مند دکھائی دیتی۔ وہ پردہ نہیں کرتی تھی، چادری اوڑھے مہمانوں میں چلی آتی، وہ بھی اصرار کے بعد۔ حمید اس کا میل جول پسند نہ کرتا۔ مگر خواتین کی آمد پہ پونم کو چھپائے رکھنا بھی معیوب سا لگتا۔ یہ بھی خدشہ تھا کہ پڑوسی یا ہم قبیلہ خفا ہو جاتے۔ 'بدقوم باش بے قوم مباش' جیسا محاورہ تو صدیوں میں بنا تھا، عقل کا نچوڑ تھا۔ لہٰذا وہ اپنے قبیلے کی بھی خوشنودی حاصل کرتا۔ پونم کو اردو، پشتو اور انگریزی زبان آتی۔ کالونی کے تین شاعر اس سے شاعری کی بات کرتے تو وہ معذرت کر لیتی کہ اسے شاعری نہیں آتی۔ وہ تینوں ہی شادی کے امیدوار تھے۔ انہوں نے باہم فیصلہ کر رکھا تھا کہ کسی سوئمبر کی بجائے پونم جسے پسند کرے گی باقی دونوں دست بردار ہو جائیں گے، اپنی ہار مردانہ وار برداشت کریں گے۔ پونم بلا کی ذہین تھی۔ ان کی دی ہوئی شاعری کی کتابیں اس نے چند ہی روز میں ازبر کر لیں۔ اور یاداشت کا یہ عالم تھا کہ غالب کا دیوان چند ہی راتوں میں یاد کر لیا۔ جس سے شاعر چکرا کے رہ گئے۔

تینوں کا رشتہ حمید نے لاپرواہی سے ٹھکرا دیا۔

اس کے قبیلے کا اپنا ملک بھی بیٹے کے لیے رشتہ مانگنے آیا تو بات نہ بنی۔

پیش امام ایک بڑی مذہبی جماعت کا عہدیدار تھا۔ حکومت اس سے کانپتی، جیسے کبھی صلیبی بادشاہ پوپ کے سامنے گھگھیانے لگتے تھے۔ حمید نے ان کا استقبال کیا، چائے پلائی مگر انکار کر دیا۔ مولوی جمیل سخت ناراض ہوا۔

''شادی شریعت کا مسئلہ کا آپ انکار کیوں کرتے ہیں''۔

حمید بدستور لاپرواہی سے باتیں کر رہا تھا ''میری ذاتی مرضی ہے''۔

جمیل طیش بھی آگیا ''شریعت میں مرضی نہیں چلتی، کفر کا فتویٰ لگ جائے گا''۔

حمید سنجیدہ بلکہ خوف زدہ ہو گیا۔ کفر کا فتویٰ لگے تو لوگ چھان بین کیے بغیر ہی اس شخص کو قتل کر کے سڑکوں پہ گھسیٹتے پھرتے ہیں۔

"میں بھی قوم قبیلے والا آدمی ہوں، کوئی ڈومی سائیل نہیں، ذرا سنبھل کر بات کریں"۔

ہیرے کو ہیرا کاٹتا ہے۔ جمیل بھی محتاط ہو گیا۔

"خیر! آپ کو اختیار ہے۔ سوچ سمجھ لیں۔ میرے بیٹے میں کیا کمی ہے۔ میرے بعد وہی مالک ہے۔ باپ کے بعد بیٹا ہی اس عہدے پر رہتا ہے"۔

حمید نے بھی مفاہمت میں بہتری جانی۔

"اچھا سوچتا ہوں، دیکھیں کیا راہ نکلے"۔

ماحول دوبارہ دوستانہ ہو گیا۔

اتنے میں یہ افواہ پھیلی کہ پونم کا شناختی کارڈ نہیں ہے۔ کوئی دل جلا چھان بین کرتا رہا تھا۔ حمید کے بنگلے کو گھیر لیا گیا۔ اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ بندوقیں سنبھالے چھپاک سے آ گیا۔ بدلتی ہوئی صورت حال سے حمید بھی گھبرا اٹھا۔ اس نے چادر اور چار دیواری کے لیے سخت احتجاج بھی کیا۔ جسے ملکی سالمیت کی خاطر نظر انداز کر دیا گیا۔ حمید نے مغلوب ہو کر کہا کہ صرف افسر اعلیٰ ہی پونم سے سوالات کرے۔

جس پر افسر اعلیٰ ڈرائنگ روم میں آن بیٹھا۔ سپاہی دیواروں اور دروازوں پہ تعینات ہو گئے۔ بندوقیں یوں چھتائے رہے جیسے پونم مار ڈالے گی۔

چادری پہنے لشکارے مارتی پونم سامنے آن بیٹھی۔ سوال و جواب ہوئے۔ حمید کے ہاتھوں کے طوطے اڑے ہوئے تھے۔ اس نے بھی پہلو میں جگہ بنائی۔ ملازمین کو کچن میں بند کر دیا گیا تھا۔ افسر کا لہجہ پہلے جارحانہ و تحکمانہ تھا۔ پھر اس کے لہجے میں نرمی آتی چلی گئی۔ ایک بار تو وہ دھیرے سے ہنس بھی دیا۔ پوچھ گچھ کے بعد وہ مسکراتا ہوا نکلا۔ باہر جاتے ہوئے وہ بڑی کوشش سے اپنی مسکراہٹ کو قابو کیے رہا۔

اس کے جاتے ہی پڑوسی چلے آئے۔ وہ بھی خیر خیریت پوچھنا چاہتے تھے۔ حمید نے ملازموں کے ہاتھ پیغام بھجوایا کہ وہ اس قدر اپ سیٹ ہو چکا ہے کہ کسی سے گفتگو نہیں کر سکتا۔

چند ہی روز میں یہ خبر پھیل گئی کہ پونم کا شناختی کارڈ کھو چکا تھا، دوبارہ بنوایا جا رہا ہے۔ مگر حمید سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ وہ کس قوم قبیلے سے ہے؟ ایسے بہت سے سوالوں کے جواب کارڈ ملنے پر خود ہی عیاں ہو جاتے۔

پونم حسن و جمال کا مکمل نمونہ تھی۔ اسے زکام، بخار بھی نہ ہوتا۔ کرونا کی وبا پھیلی تو بھی اس نے ماسک نہ لگایا۔ اس کی چال قیامت تھی۔ اس کا چہرہ کوہ زرغون کی طرح تر و تازہ تھا۔ پین کاریزسی اس کی شفاف آنکھیں تھیں، ایسی نازک انگلیاں کہ چائے کا کپ دیتی تو تعجب ہوتا ایسا وزن کیسے سہہ رہی ہے۔ اسے غصہ بھی نہ آتا۔ کبھی کوئی عاشق دل کھول کے رکھ دیتا تو وہ مسکرا کے رہ جاتی۔ کوئی دل جلا اس سے لڑتا، خودکشی کی دھمکی دیتا تو بھی پرواہ نہ کرتی۔ اس کے چاہنے والوں کی تعداد بہت بڑھتی جا رہی گئی۔ حمید کا بنگلہ سبھی کی نظر میں رہتا۔ وہاں جانے کسی بہانے حمید سے ملنے کی راہ نکالتے تاکہ پونم کے دیدار ہوں، شرفِ گفتگو حاصل ہو۔ فون یا موبائل کو وہ ہاتھ نہ لگاتی۔ باہر جانے، لانگ ڈرائیو سے بھی انکار کر دیتی۔ نہ تو اسے لباس کا شوق تھا اور نہ ہی زیورات کا۔ ایک ہی لباس پندرہ بیس روز پہنے رہتی۔ لباس کے معاملے میں خوش ذوق نہ تھی۔

پونم کے لیے شاعروں نے غزلیں بھی کہیں۔ پونم ایک مغرور، سنگ دل، بے رحم دیوی کہلاتی۔ یوں تو خوش دلی سے پیش آتی مگر ہاتھ ملانے سے آگے نہ بڑھتی، ہم آغوشیوں کا تو ذکر ہی کیا۔ بعض کہتے کہ جنت کی حور ہے، جانے کیسے کچھ عرصے کے لیے زمین پہ اتر آئی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے چاہنے والے اپنے اپنے خاندانوں پر دباؤ ڈالنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ منہ مانگے ولور کی بھی بات کی۔ بہت سے شرفا نے حمید کو بتلایا کہ اس کی پسند کا ولور دیں گے، بنگلہ روپیہ بڑھیا کار بھی حمید کو دیں گے۔ اتنی بڑی رقوم کا سن کر حمید چکرا گیا۔ مگر بس وہی مرغ کی ایک ٹانگ: انکار اور مسلسل انکار، کہیں تاخیری حربے۔ وہ پونم کی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حمید کے گھر کے سامنے ہی چند رقیبوں میں لڑائیاں بھی ہوئیں۔فائرنگ سے کچھ زخمی بھی ہوئے۔حمید کا جینا دوبھر ہوگیا۔اس کے قبیلے نے جرگہ بلوایا جس میں حمید پر تابڑ توڑ حملے کیسے کہ وہ پونم کی شادی کیوں نہیں کرتا؟ پونم اس کی کیا لگتی ہے؟ کہیں آنے جانے کیوں نہیں دیتا؟ زمین اب حمید پہ تنگ ہو چکی تھی۔اس نے ہفتہ بھر سوچنے کا وقت مانگا، جو اسے دے دیا گیا۔کالونی میں بھی یہ خبر پھیل گئی۔ ہر امیدوار اپنے طور پر مسرور ہوا کہ امید کی کلی کھلنے والی ہے ۔ہر ایک سمجھتا تھا کہ پونم اسی کے گلے میں ورن مالا ڈال دے گی۔کیوں کہ وہ سبھی کو مسکرا مسکرا کر ملتی۔ہزار ہزار والٹ کے برقی جھٹکے اپنی اداؤں سے مارتی۔

حمید نے اتوار کے روز سہ پہر میں ایسے سب لوگوں کو مدعو کیا۔سبھی دوڑے چلے آئے کہ پردہ اٹھنے کو ہے، دیکھئے کس کے مقدر میں پونم لکھی ہے۔بعض لوگ دل موم کرنے کے تعویز بھی لیتے آئے۔ہر امیدوار بے تاب ہوا جاتا تھا۔

مہمانوں کو احترام سے بٹھا کر وہ پونم کو ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ساری محفل پونم کے حسن سے مسحور ہوگئی۔ پونم نے سبھی کو سلام پیش کیا۔وہ رسٹ کلر کے لباس میں تھی ۔میرون چادری میں اس کا چہرہ آماج پہ ٹکے ہوئے چاند سا لگ رہا تھا۔حمید نے اٹھ کر پونم کے صوفے کے پیچھے کھڑے ہونے کی جگہ بنائی۔ پونم کا حسین دل ربا چہرہ آگے کی جانب جھکایا۔کچھ کھٹ پٹ کی اور اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھوں میں پونم کا سر تھا جو باقی دھڑ سے الگ ہو چکا تھا۔

ناظرین کی چیخیں نکل گئیں، پسینے چھوٹ گئے۔

کمال مہارت سے حمید نے پونم کا سر دوبارہ فٹ کر دیا۔

”پونم ایک روبوٹ ہے، جسے میں نے اسپیشل آرڈر پر بنوایا تھا، یہ روبوٹ میری ساتھی ہے۔“

لوگوں کو ذرا ہوش آیا، کچھ سنبھلے بھی۔

”عورتوں کیا کمی تھی، یہ تو بچے بھی پیدا نہیں کر سکتی۔“

حمید نے طویل سانس لی۔ "کتنے بچے اور پیدا کریں یہ جوج ماجوج۔ ہماری آبادی بائیس کروڑ ہے، دنیا کی ساڑھے سات ارب۔ رہی عورت تو وہ بھی endangered species کی طرح معدوم ہوئی جاتی ہے۔ ہمارے ستر فی صد مقدمات عورتوں سے متعلق ہیں ۔عورت کے لیے قتل یا عورت کا اغوا یا عورت شوہر کا قورمہ بناتی ہے، قتل کرکے میان غنڈی (دو پہاڑوں کے درمیان) پھینک آتی ہے۔ نہ تو یہ بلا سب بولتی ہے نہ ہی فلرٹ مارتی ہے۔ اس کے پروگرام میں محبت ڈالی گئی ہے۔ بس محبت ہی کرے گی۔ بک بک جھک جھک نہ کرے گی۔ عورت کا حسد بھی اس کے پروگرام سے نکالا گیا ہے۔

ایک بقراط احتجاج پہ اتر آیا۔ "عورت تو محبت کرتی ہے، یہ کیا کرے گی"۔

حمید بھنا اٹھا۔ "جی ہاں انا کونڈا کی طرح محبت سے یوں دبا کر بھینچ کر ہرن کو خرگوش کے برابر بنا کر سموچا ہی نگل جاتی ہے، دنیا سے کاٹ دیتی ہے"۔

چوں کہ حمید نے پونم کا بٹن آف کر رکھا تھا، وہ بت بنی بیٹھی تھی۔

ایک مشر نے زبان کھولی۔ "پہلے محبت کرنے والی عورتیں ہوا کرتی تھیں، اب عورتیں دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہیں۔ کیلکیو لیٹر ٹائپ ہیں، سرمایہ دارانہ نظام نے عورت کو بھی قابل فروخت شے بنائے رکھا۔ شاید یہی وجہ ہے وہ نرمی، محبت، شفقت، قربانی، ایثار جاتا رہا"۔

سبھی حمید کو دیکھ رہے تھے، جیسے اسی سے جواب چاہتے ہوں۔

حمید نے بھی تاخیر نہ کی۔ "قدیم ہند میں کاما سوترا فلسفہ تھا کہ میاں بیوی باہم محبت کریں، ایک دوسرے کو خوشی دیں تو گھرانا خوش ہوگا۔ ہر کنبہ خوش ہوا تو گاؤں اور شہر خوش ہوں گے، شہر کیا ہیں؟ ہزاروں لاکھوں گھرانوں کا مجموعہ۔ اگر کاما سترا نہ ہوا تو کنبے لڑیں گے، جھگڑیں گے، جس سے پورے راج میں بدنظمی پھیل جائے گی"۔

حمید نے پونم کا بٹن آن کر دیا۔ اس نے دوبارہ سبھی کو سلام کیا اور مسکرانے لگی۔

اگلے روز ملاقاتیوں کا ہجوم چلا آیا۔

حمید پریشان بھی ہوا کہ تو ہنگامہ ختم ہوگیا تھا یہ، کیا افتاد آن پڑی

ملازموں نے سبھی کو بٹھا کر اور چائے سے تواضع کی۔ تر خا، یمانی، سبز اور دودھ والی چائے پیش کی۔

حمید نے خود کو سنبھالا۔ چوں کہ کرونا کے باعث معانقہ مصافحہ متروک ہو چکا تھا، وہ سلام کر کے بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

''حمید صاحب'' ملک نے گفتگو کا آغاز کیا،'' ہماری ضرورت پونم جیسی عورتیں ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ ہماری پسند کی عورتیں جاپان سے ہمیں بنوا دیں۔ اگر سولر بیٹری ہوں تو بہتر ہوگا۔ ان کی قیمت بھی ولور سے کم ہی ہوگی۔ ہم اپنی بہنیں بیٹیاں ولور کے نام پہ دیتے آئے ہیں۔ یہ تو روبوٹ ہیں، ان کے بیچنے پہ ندامت بھی نہ ہوگی اور پھر ایسی پونمیں تو نیک بیبیوں حوروں کی طرح ہر ایک کو کھلے دل سے قبول کریں گی، کاماسوترا پر عمل ہوگا۔''

حمید کے قہقہے پہ ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔

''مشرانوں! آپ جانتے ہیں کہ پونمیں کیوں مانگ رہے ہیں؟''

ان کی خاموشی ہی ان کا جواب تھا، وہ سبھی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

حمید نے سکوت توڑا۔

''کیوں کہ اکیسویں صدی کا مرد روبوٹ بن چکا ہے۔''

دروج

بہتے ہوئے خون سے شہر میں زنگ سا لگ گیا تھا۔ کبھی دھماکہ، کبھی گولی چاٹ جاتی۔

ہم تو جیسے تیسے زندگی بھوگ ہی رہے تھے مگر طارق کا نروس بریک ڈان ہوگیا۔ اسے ہسپتال میں داخل کرانا پڑا۔

کچھ روز بعد وہ سنبھل سا گیا۔ ڈاکٹروں نے حساسیت کم کرنے کے لیے اسے گولیوں پہ رکھ دیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ تاکید بھی کر دی کہ دماغی کام نہ کرے۔

اس کے والد ایوب ٹھیکیدارِ کینٹ میں کام کرتے تھے۔ یہ وہ دنیا ہے جہاں غم کی کوئی رات نہیں۔ کبھی مسیحی قبرستان کی دیواریں گرا کرنئی دیواروں کا ٹھیکہ ملتا۔ ان دیواروں پہ دلکش جھروکے بھی رکھے جاتے، جیسے صلیبیوں کی دنیا سے نکل کر روحیں کینٹ میں دہشت گردی نہ کریں۔ کبھی یہ بڑا سا مینار بناتے پھر توڑ کر نیا بنواتے، کبھی ایک حسین پارک بناتے۔ غرضیکہ سارا سال کام چلتا رہتا۔ اس بیوٹی فکیشن آف کینٹ کے لیے وزیر اعلیٰ نے حسبِ معمول خزانے کا منہ کھول رکھا تھا۔ ٹھیکیداری میں تو یوں بھی دماغ کی نہیں تعلقات کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

مگر جانے کیوں طارق کی حساسیت بڑھتی ہی چلی جارہی تھی۔ قتل و غارت، افراد کا

اغوا اور پھر غائب کر دیا جانا، مسخ شدہ لاشوں کا ملنا۔ وہ تڑپ تڑپ اٹھتا۔ کبھی دوست اسے سمجھاتے کہ یہی تو تاریخ انسانی ہے۔ گبن نے لکھا تھا کہ انسانی جرائم کے اندراج کا نام ہی تاریخ ہے۔ مگر وہ چوں کہ کم پڑھا لکھا تھا، بیکل ہو جاتا، دکھی ہو کر تڑپنے لگتا۔ کبھی ہم بغداد میں جو مسلمان کے سر کاٹ کر اہرام بنائے گئے، یاد دلاتے اور کبھی دہلی کا قتل عام، پھر بٹوارے کی کہانیاں مگر اس مردِ ناداں پہ کلام ضائع جاتا۔

ٹھیکیداری چوں کہ منشیوں کے ذریعے ہی چلتی، اسے خاصا وقت سوچنے کے لیے ملتا۔ ہم نے اس کے والد کو مشورہ دیا کہ طارق کو حساب کتاب پہ لگایا جائے تاکہ لاشوں کا حساب رکھنے کی بجائے روپے کے اعداد کی بھول بھلیوں میں ہی الجھ کر رہ جائے۔

دوائیوں سے طارق کو خاصا افاقہ ہوا۔ اس کی باریک بینی نکتہ چینی میں بھی فرق آیا، اور بقول اس کے، سر کچھ بوجھل سا رہنے لگا تھا۔

"سر کچھ بھاری سا لگتا ہے۔"

دوست بہت خوش ہوئے۔ "شکر ہے کہ پاؤں بھاری نہیں ہوئے۔"

محاورہ اس کے سر سے گزر گیا۔

وہ اکثر دوستوں کے دفتروں میں چلا آتا، یا پھر شام کے کھانے پہ مدعو کرتا۔ اس کے والد کا قول تھا کہ ایک کامیاب ٹھیکیدار کو دعوتیں بکثرت کرنی چاہئیں۔ یہی نہیں بلکہ اٹک میں ایک باغ خرید کر مہمان خانہ بھی بنوا ڈالا۔ تاکہ دعوتوں میں سہولت رہے، کیوں کہ اعلیٰ افسر پیٹ سے سوچتے ہیں۔ ڈاکٹروں نے شادی کا بھی مشورہ دیا تھا کہ ارسطو کی دونوں بیویوں نے اسے بھی چکرا دیا تھا، اگر اس کی چار شادیاں کرا دی جائیں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ پنجاب میں دولہا خریدا جاتا ہے، ہمارے ہاں دلہن۔ اور ایوب کے پاس تو دولت کی کمی نہ تھی۔

طارق کو فلمیں بھی مار دھاڑ والی ہی پسند تھیں۔ یوں تو وہ ایک وجیہہ جوان تھا، بس

آنکھیں کچھ شرمیلی سی تھیں، جیسے کسی شرمیلی کی آنکھیں اسے جڑدی ہوں۔ اس چہرے پہ وہ آنکھیں نہ جچتیں، شاید اسی لیے دُکھی دُکھی سا رہتا، جیسے سارے شہر کا وہی گورگن رہا ہو۔

ابھی ہم اسے محبت کی دنیا میں دھکیلنے کی کوشش میں ہی تھے کہ وہ خود ہی کود پڑا۔ جذباتی تو سپنوں میں بھی ڈوب جاتے ہیں۔

شام میں ہم دونوں گولڈسٹی کافی پینے جایا کرتے۔ حسینوں کے لشکر وہاں مارتے کاٹتے پھرتے، نہ تو ان پر دفعہ 144 لگتی اور نہ ہی کوئی ہاتھ روکتا۔ جگر کو قوت اور آنکھوں کو طراوت ملتی۔

سیڑھیوں پہ اچانک ہی ایک حسینہ کا پرس اس سے ٹکرا کر تین چار سیڑھیاں نیچے جا گرا۔

ملکوتی حسن نے قہر بھری نظروں سے طارق کو دیکھا تو وہ لڑکھڑا کر مجھ سے ٹکرا گیا۔ میں گرفت میں نہ لیتا تو وہ شاید پرس سے بھی دور جا گرتا۔

اس قاتلہ نے جو طارق کے ہوش اڑتے دیکھے تو شعلہ فشاں سورج کی بجائے مسکراہٹ میں بھیگ گئی۔ ویسے مجھے تو لگا تھا خود ہی جھلاتی آ رہی تھی اور دے مارا۔

وہ اچانک دلسوزہ کا چاند بن گئی۔ یوں پلک جھپکتے جلتا چہار غاش پل بھر میں ایک تباہ کن مسکراہٹ میں منقلب ہو گیا۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین تھی۔ کسی لانگ ویک اینڈ پہ جنم لیا ہو گا۔ خالق نے بھی اسے بنانے میں اڑھائی دن تو لیے ہی ہوں گے۔ مسکراہٹ سے ڈھلا چہرہ ہنسی روکنے کی کوشش میں خاتول کا دل ربا گلدستہ بن گیا؛ شگرف سا۔ مگر اب چہرے پہ جلال نہ تھا، جمال بکھر گیا تھا۔

"اپنے آپ کو تو سنبھالیں، کبھی پرس کو ٹکر مارتے ہیں، کبھی خود ہی گرنے لگتے ہیں۔" مترنم آواز آئی۔ جیسے شین غزل کی کھنکتی صدائیں، پُراسراری۔

طارق نے خود کو سنبھالا۔ اتفاقاً لوگ بھی کم تھے۔ اس نے پرس کی چیزیں سمیٹ کر

دوبارہ پرس اسے پیش کیا۔

"آپ کیا سزا دینا چاہیں گی؟ کیا جرمانہ نافذ کریں گی؟" طارق التجا پہ اتر آیا تھا۔

"کچھ نہیں، بس ٹکر نہ مارا کریں راہ چلتوں کو۔" اس نے برسٹ مارا۔

ہماری منت سماجت پہ وہ ریسٹورنٹ میں کچھ لینے کے لیے آمادہ ہوگئی۔

ساتھ ہی اس کی چھوٹی بہن تھی۔ مگر وہ ممنوعہ بور کی نہ تھی۔ عام سی لڑکی تھی۔ البتہ مولڈ دونوں کا ایک ہی سا تھا۔

"ویسے وقت تو کھانے کا ہے۔" طارق اب دھرنا دے چکا تھا۔

اس نے سوپ کا آرڈر دیا۔

پھر میری جانب متوجہ ہوا۔ "تم ذرا اپنا مریض دیکھ آؤ، تمھیں دیر ہو رہی ہے۔ رات کو بات کرتے ہیں۔"

میرا جی تو چاہا کہ پانی کی بوتل اٹھا کر طارق کے سر پہ ماروں۔ مگر وہ پلاسٹک کی تھی۔ پھر وہ تھا بھی ذہنی دباؤ میں۔ ہم اسے جس مقتل میں دھکیلنا چاہتے تھے، وہ خود ہی اس میں اتر چکا ہے۔

میں نے اس حسنِ مجسم کو نگاہوں کے لیزر سے فوکس کیا اور جتنا حسن سمیٹ سکتا تھا، دل میں اتار کر اجازت لیتا ہوا باہر نکل گیا۔ جیسے اجنتا کی مورت باہر نکل آئی ہو چادری پہنے۔ جیسے سلیپنگ بیوٹی انگڑائی لے کر پہاڑ سے الگ ہو بیٹھی ہو۔

اگلے روز وہ دفتر چلا آیا۔ بڑی ہی معذرت کی۔

میں غصے میں لاتعلقی سے چائے پیتا رہا تو اس نے خود ہی بڑھ کر گلے لگا لیا۔

"تمہارے والد تو فوت ہو چکے ہیں؟" طارق نے سوال کیا۔ اس احمقانہ سوال پہ مجھے حیرت بھی ہوئی۔

"لگتا ہے وہ تمہارے ہوش کے علاوہ یادداشت بھی اپنے پرس میں ڈال کر چلتی

بنی۔تم فاتحہ میں بھی تو شامل تھے۔" میں نے اسے غور سے دیکھا۔عشق میں بہت سے لوگ مجنوں بن چکے تھے۔اس کی یاداشت بھی شاید ختم ہو چکی تھی۔

"ہاں!" طارق چہکا "یاد ہے آج میں نے یتیموں کو رات کے کھانے پہ بلایا ہے۔ ضرور آنا سجی بھی ہوگی لانڈی بھی۔"

یہ سن کر میرا غصہ جاتا رہا۔"یہ دعوت ہے یا خیرات؟"

ہمارے ہاں ڈرنک ساتھ ہو تو دعوت کیا جاتا ہے ورنہ خیرات۔

طارق نے اٹھتے ہوئے یقین دلایا کہ رات کی دعوت ہے۔

رات کو کھانے پہ سبھی دوست بہکے ہوئے جلد سے جلد اس پرس والی کی کہانی سننا چاہتے تھے۔

طارق نے بتلایا کہ اس کا نام دروج ہے، بی ایس کرنے کے بعد گھر میں ہی شوقیہ پینٹنگ کرتی ہے۔ یوں لگتا تھا کہ اس محبت کے زینے سے وہ تصوف کی ساری ہی منازل طے کرنا چاہتا تھا۔ہمیں خوشی بھی ہوئی اور قدرے تشویش بھی کہ کہیں بالکل لیوانہ بن کر دروج کے لیے چاک گریباں ہی نہ پھرنے لگے۔مگر وہ بہت خوش تھا، قہقہے لگا رہا تھا۔

زندہ دل زندگی لوٹ آئی تھی۔

طارق بالکل ہی بدل گیا۔اس خون اگلتے تذبذب میں ڈوبے شہر سے نکل کر طارق بیرونی دنیا سے کٹ سا گیا تھا۔ہمیں بتلایا کہ اخبار بند کر کے وہ خبریں بھی نہ سنتا۔ہم اسے کسی کی ٹارگٹ کی خبر سناتے یا جو پوچھ گچھ کے لیے اٹھائے جاتے تو وہ سنی ان سنی کر دیتا۔البتہ اس کے لباس میں قرینہ آگیا تھا۔اس کا ساتھی موبائل تھا، جو اُسے پرس والی سے ملائے رکھتا۔اس کا جنون ایسا بڑھا کہ دوستوں میں بھی بیٹھ کر موبائل پہ میسجنگ کرتا رہتا۔دوست ٹوکتے کہ تم ہم سے ملنے آئے ہو یا کہ میسجنگ کرنے کے لیے۔

اس نے پرس والی کی بہت سی تصویریں بھی موبائل میں محفوظ کر لی تھیں۔ کرخسہ

میں، کبھی سپین کاریز کے ساتھ تو کہیں windy corner میں جہاں شوریدہ سر ہوائیں دروج کا لباس اتارنے لگتیں۔ اس کی حسین زلفیں چلتن کے ناگوں سی لہرانے لگتیں۔

ہم نے اسے آگاہ بھی کیا کہ موبائل ہی محبت کرنے والوں کا دشمن بھی ہے۔ پہلے تو کانوں کان کسی کو خبر نہ ہوتی۔ کوئی پکڑی بھی جاتی تو جھوٹی قسم کھا کے بچ جاتی۔ مگر اب تو ایک ایک منٹ کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ موبائل کی تصویریں ڈیلیٹ بھی کر دیں تو وہ مین سرور میں کہیں محفوظ رہتی ہیں۔ سرکار تمام ریکارڈ محفوظ رکھتی ہے۔

طارق اس تنبیہ پر خفا ہوا۔

"تو کیا مجھے ملٹری کورٹ محبت کرنے کے جرم میں کوڑوں کی سزا دے گی؟ محبت ناقابل دست اندازی پولیس ایک عمل ہے، ورنہ تو دنیا کے بڑے عاشقوں کو عمر قید بول دیتے۔"

ایک بار اتفاقاً ہی کسی دعوت پہ سائیکاٹرسٹ سے ملاقات ہوگئی۔ ان کا وقت یوں تو بکاؤ ہوتا ہے۔ دوستوں سے زیادہ مریض دن میں ملتے ہیں۔ مگر دعوت کے باعث وہ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور مہمانوں کو بھی شکاری نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ممکنہ مریض کون ہوسکتا ہے۔ مہنگائی، عدم تحفظ، سرکاری دباؤ، حکومت کے لڑکھڑاتے قدم جن سے وہ عوام کا جنازہ لیے جا رہی تھی۔ سرکار سبھی کو پاگل کے لیے دے رہی تھی۔ میں نے طارق کے دھانسو عشق کا بتلایا کہ اب وہ غموں کی دنیا یا پھر حقیقی دنیا سے کٹ کر پرس والی کے پرس میں کنڈلی مار کے آبیٹھا ہے۔ شاید وہ لڑکی پیپرن ہے کہ اچھے بھلے ہمارے دوست کو بس میں کرلیا۔ ڈاکٹر خوش ہونے کے بجائے بے حد ناخوش ہوا۔ "ہارٹ یا سائیکاٹری کا مریض اپنی قوتِ ارادی کے بس پر دوا نہیں چھوڑ سکتا وہ تو OCD کا مریض ہے۔ یہ عشق اس کے لیے خطرناک ہوسکتا ہے، اسے کہنا مجھ سے ملے۔" پھر خود ہی مسکرا اُٹھا۔ "فیس نہیں لوں گا۔ ہمارے ملک کا نام پاگلستان ہونے کو ہے۔"

طارق نے میری بات ہنسی میں اڑادی۔

"میں نے اپنے گرد ایک دائرہ ڈال دیا ہے جس میں پرس والی اور میں ہوں، باقی کوئی جیئے مرے مجھے کیا۔ جنہیں ریاست اغوا نہیں کرتی، وہ بھی تو مر جاتے ہیں۔ کتنے ہی لوگ تو کرونا کی دوا سے مرتے جا رہے ہیں۔ میں نہیں ملوں گا۔ مجھے تو وہ ڈاکٹر بھی پاگل سا لگتا ہے۔"

میں ڈاکٹر کی رائے کو اہمیت دے رہا تھا۔"اس دوائی کا کیا کیا؟"

طارق نے قہقہہ لگایا۔"پرس والی نے وہ ساری گولیاں پیر پنجہ کے چشمے کے پاس پھینک دی تھیں۔"

ہمارے ہاں چوں کہ بیوی کا نام نہیں لیا جاتا اسے فیملی یا گھر والے کہا جاتا ہے، طارق بھی اپنے خاندان کا وقار قرار دیتے ہوئے اسے دروج کی بجائے پرس والی ہی کہا کرتا۔

ہم اکثر انہیں ساتھ ساتھ گھومتے پھرتے دیکھتے۔ کہیں کھانا کھاتے، کہیں جوس پیتے۔ اس چھوٹے سے شہر میں ریسٹورینٹ ہی کتنے تھے۔

طارق جب دوستوں کے ہاں آتا تو بھی اس کا موبائل اس کی جان نہ چھوڑتا۔ کمبخت کسی جاسوس کی طرح دم مارنے نہ دیتا۔ جہاں کہیں سگنل نہ ہوتے تو طارق ان علاقوں میں ساتھ جانے سے ہی انکار کر دیتا۔ پہاڑی سلسلوں کے باعث اکثر جگہ موبائل کے سگنل ہی نہ آتے۔ اسے تو گویا موبائل سے مودت ہو گئی تھی۔ جس کے بنا اس کا جینا ہی مشکل تھا۔ اس کے سانس بند ہونے لگتے، عجیب سے ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا۔

طارق کے گھر والے بار بار رشتہ مانگنے گئے، وہ بھی دعوتوں پہ چلے آئے۔ دروج ان کی بہو کا درجہ رکھتی۔ اگرچہ اب تک منگنی بھی نہیں ہوئی تھی۔ طارق اسے تحفوں کی بارش میں بہا کر لے جانا چاہتا تھا۔ اب وہ ٹھیکیداری کو بھی کم ہی توجہ دیتا۔ ایک پرل وہائٹ گرینڈ بھی خرید لی۔ بڑے شاہانہ ٹھاٹ تھے، امیر زادوں والے۔ دروج تو ہم زاد کی طرح ساتھ ساتھ ہی رہتی۔

دروج کو چراغ کا جن مل گیا تھا۔

پھر ان کے تعلقات کشیدہ ہونے لگے۔ دروج پہ ایک سرمایہ دار لٹو ہو گیا۔ جیسے سٹی پہ اچانک ہی ریل کو نیا انجن آلگتا ہے۔ دروج نے ایک نئے مرد کی رفاقت قبول کر لی۔

طارق میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرتا۔ مقابل قوم والا آدمی تھا۔ وہ دروج پہ ہی برس پڑا۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں، زندگی بھر کرتی ہی رہوں گی۔" دروج نے طارق کو یقین دلایا۔

جس پہ طارق بھڑک اٹھا۔"میں روح کا حاکم بنا رہوں، محبت کی معراج پہ اکیلا اور جسم کسی کی ملکیت ہو۔ تم کیا محبت کو جسم سے الگ کر سکتی ہو؟"

دروج بھلا ہار ماننے والی کب تھی۔"جسم کی بات ہے تو لڑکیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ مجھ میں ایسی عجیب بات کیا ہے۔ زندگی بھر محبت کرتی ہی رہوں گی۔ دروج تو اس جسم کا نام ہے جو ماں باپ نے دیا، روح تو تمہاری ہے۔"

طارق بے یقینی سے اسے دیکھتا رہا۔"یعنی چھپ چھپ کر ملو گی؟"

دروج نے فیصلہ سنا دیا۔"نہیں، میں دو آدمیوں کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔"

یہ ساری باتیں طارق نے ہی مجھے خود بتائیں، دروج کی طرح ہاتھ نچا کر بھی دکھایا۔

وہ ٹُن سا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ اسٹاف نہ دیکھ لے ورنہ مفت کا الزام لگے گا کہ دفتر میں پی پلا کر لوگ آتے ہیں۔ یونین بھی پمفلٹ نکال دے گی۔

میں طارق کو شہر سے باہر لے گیا۔

ہم کھانا کھا کے لوٹے تو میں نے اسے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جانا چاہا۔ مگر اس نے انکار کر دیا۔"اب بہت دیر ہو گئی، مجھے تو اب ضرورت ہی نہیں رہی۔" چوں کہ وہ بہکی بہکی

باتیں کر رہا تھا، میں بھی ہنس کے ٹال گیا۔

ایک قوم والے سے طارق ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔

طارق نے فیصلہ سنایا،"محبت کا اظہار بہادری نہیں، اس کا حصول بہادری ہے۔تم جانتے ہو کہ ہٹلر اور نپولین جیسے ہار گئے، سبھاش چندر بوس ہار کر گمنامی میں چلے گئے، بالکل روپوش ہی ہو گئے۔اپنی شکست تسلیم کرنا مردوں کا ہی کام ہے۔"

مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں تھی تو میں نے بھی موضوع بدل دیا۔

ہمارے اصرار کے باوجود سائیکاٹرسٹ کے پاس جانے پہ آمادہ نہ ہوا۔اور نہ ہی وہ کوئی بچہ تھا کہ ہم اسے گود میں اٹھا کے لے جاتے۔

چند روز بعد میں ملنے گیا تو وہ قدرے نارمل تھا۔مگر باتیں کرتے ہوئے پٹری سے اتر جاتا۔وہ اب تک دروج میں ڈوبا من کے کوہ مراد میں اسے تلاشتا۔

"میں پرس والی کو ایک قیمتی تحفہ دوں گا شادی کا۔" طارق نے فیصلہ سنایا۔"اور یہ تحفہ تم پہنچاؤ گے، وعدہ کرو۔"

میں نے ہاتھ ملا کر وعدہ کیا۔"تم جانتے ہو تمہارے رقیب کا باپ سیاسی آدمی ہے۔ہر ایک حکومت میں اس نے دولت بنائی، تھائی لینڈ اور دوبئی میں ہوٹل خرید لیے۔اس سے زیادہ قیمتی تحفہ تم دے سکو گے؟ کیا یہ گرینڈ اسے دو گے؟"

طارق کا اعتماد بحال تھا۔"تم دیکھنا ایسا قیمتی تحفہ اسے کوئی بھی نہیں دے سکتا، پہنچاؤ گے تو اعتراف کرو گے، مان جاؤ گے میری دریا دلی بلکہ بے جگری۔قیمتی تحفہ دل والے ہی دیا کرتے ہیں۔"

طارق ہی کہ کہنے پہ میں نے دروج سے موبائل پہ رابطہ کیا، پہلے میسج کیا کہ طارق کا دوست ہوں، میری کال اٹھاؤ۔

بڑے اچھے طریقے سے پیش آئی۔وہ جانتی تھی کہ میں طارق کا سب سے عزیز دوست

ہوں۔

”طارق نے آپ کی چادری مانگی ہے جو بی بی نانی کے مزار پہ اس نے آپ پہ ڈالی تھی، وہ میں آپ سے لینے آؤں گا۔“

دروج اس مطالبے پر سخت حیران ہوئی۔ کچھ دیر ساکت بھی رہی۔

”میں آپ کا نمبر سیو کر رہی ہوں۔ کل گولڈ سٹی کے ریسٹورانٹ میں میری چھوٹی بہن آپ کو چادری پہنچا دے گی۔ اور جو زیور وغیرہ دیے تھے، وہ بھی واپس کر دوں؟“ وہ فراخ دلی سے بولی۔ گولکنڈہ کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ پورا خیلسن ہی اس کا تھا۔

”جی نہیں، صرف چادری۔“

شادی کی تیاریوں کے باعث دروج نے کہیں آنا جانا موقوف کر دیا تھا۔

اس کی بہن نے وقتِ مقررہ پر شاپر میں بند چادری مجھے پہنچا دی اور پھر بغیر کچھ لیے وہ اجنبی انداز میں واپس چلی گئی۔

میں حیرت سے شاپر دیکھتا رہا۔ 'کمال ہے، صرف چادری!'

میں فوراً ہی طارق کے ہاں پہنچا۔ وہ بے چینی سے میری ہی راہ دیکھ رہا تھا۔

اس نے چادری نکالی، اسے سونگھا اور چہرے سے لگا لیا۔

مزید بدحواسیوں کو دیکھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ میں واپس چلا آیا۔

اگلی سہ پہر موبائل چیخ اٹھا۔ طارق کی تصویر سکرین پر ابھرنے لگی۔

”میں نے وعدہ کیا تھا کہ پرس والی کو ایک قیمتی تحفہ دوں گا، جو تم اسے پہنچا ہو گے۔“ یوں لگتا تھا کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بول رہا ہے۔ ”میں اپنے خون میں رنگ کر دوں گا، بس اسے پہنچا دینا۔ اس کی شادی کا تحفہ ہے، میں ہار چکا ہوں۔“

میرے ہاتھوں کے طوطے کے اڑ گئے۔

”وہ لڑکی کوئی پیتھالوجسٹ ہے نہیں۔ میں اسے بلڈ بینک سے تمہارے گروپ کی

پوری بوتل لگادوں گا، مرغی کا خون لگادوں گا، چادری کو میں خون سے رنگ دوں گا پاگل۔"

طارق خوف ناک ہنسی ہنسا۔"محبت میں دھوکہ نہیں ہوتا اور پھر میرے خون سے ہی تحفہ انمول ہوگا، میں اپنی جان ہی تحفے میں دے ڈالوں گا۔ خدا حافظ۔ اپنا وعدہ نبھانا، ورنہ روزِ محشر تمہارا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ۔"

موبائل بند ہوگیا۔

ممکنہ خطرے کے پیش نظر میں ننگے پاؤں باہر لپکا۔ کار سٹارٹ کی۔

طارق کا گھر تو قریب ہی تھا، اڑتا ہوا پہنچا۔

دیگر شناسا بھی گھر میں دوڑے جارہے تھے۔

گھر میں کہرام مچا تھا۔

طارق نے تہہ لگا کر دائیں جانب چادری سلیقے سے رکھی تھی۔ چہرہ نماز کے رخ تھا۔ بائیں کن پٹی پہ اس نے گولی چلائی تھی۔

چادری خون میں بھیگی ہوئی تھی۔

میں یہ منظر نہ دیکھ سکا اور درختوں تلے ایک کرسی پر جا گرا۔

پولیس بھی دوڑی چلی آئی۔ پولیس کی مٹھی گرم ہوئی تو اتفاقی حادثہ قرار دے کر چادری اور گلاک 26 پستول بھی قبضے میں نہ لیا۔

ہر طرف شور اور چہ مگوئیاں تھیں۔ جب کہ میں سوئے ہوئے دماغ کے ساتھ آنکھیں بند کیے بیٹھا ہی رہا۔

یہ طے پایا کہ اس کی بہن کی آمد پہ اگلے روز تدفین ہوگی۔

میں نے نظر بچا کے موبائل پار کیا۔ پھر خون میں رنگین چادری اٹھالی۔ کسی نے اعتراض نہ کیا۔ اس کی اہمیت نہ تھی۔ وہ اس بری طرح سے گال سے چپکی تھی کہ بمشکل ہی الگ کیا گیا تھا۔ چادری شاپر میں ڈال کر اس پہ سیاہ لفافہ چڑھادیا۔ گھر میں کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

میں نے وقفہ پاتے ہی دروج کو خودکشی اور قیمتی تحفہ پہنچانے کی خبر دی۔

اسے یہ اطلاع مل چکی تھی، کافی دکھی سی لگی۔

اس کے گھر بھی شادی کی تیاریاں تھیں۔ عزیز و اقارب براجمان تھے۔ تاہم اس نے عقبی گیٹ سے لان میں دبے پاؤں چلے آنے کو کہا۔

اندھیرے میں عقبی گیٹ نیم وا تھا۔ اس کے وفادار ملازم نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر مجھے خاموشی سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ دروج کو بلا لایا۔ وہ بہت چوکنا اور محتاط تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اشارہ پاتے ہی مجھ پہ ٹوٹ پڑے گا۔

دروج نے سر کے اشارے سے سلام کیا۔ اندھیرے کے سبب اس کے تاثرات کا جائزہ لینا ممکن نہ تھا۔

میرے ہاتھوں سے شاپر لے کر اس نے بے تابی سے کھولا۔

مگر چادری دیکھتے ہی گھٹی گھٹی چیخ اس کے لبوں سے نکلی۔ اس نے دوپٹہ ہونٹوں پہ رکھ لیا اور ہذیانی انداز میں کچھ بولتی رہی۔ جیسے آوازوں کو سینے میں روک لینا چاہتی ہو۔

ملازم نے چابک دستی سے چادری لے کر سمیٹ کر شاپر میں بند کر دی اور کینہ توز نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

میرا فرض ادا ہو چکا تھا، میں واپس مڑا اور گیٹ کی جانب چل دیا۔

معاً ملازم نے میرا بازو تھام لیا اور پلٹنے کا اشارہ کیا۔

میں دوبارہ دروج کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"وصیت کے مطابق آپ کو قیمتی تحفہ پہنچانا ہے، میرا تحفہ یہ بکری کی کھال جیسی چادری نہیں بلکہ طارق کا موبائل ہے جس میں ہمارا سارا ریکارڈ ہے، تصویریں ہیں۔"

میری جیب پڑا موبائل تو تک کی اجتماعی قبر کی طرح بوجھل ہو کر ماتم کرنے لگا۔

میں نے دروج کے حسین لیکن سپاٹ چہرے کو دیکھا جو اندھیرے میں بھی اپنے

حسن سے منور تھا۔ جس کا احاطہ ہی مشکل تھا۔ جسے دیکھنے کے لیے ارجن کو دیوتاؤں کو بینائی دی گئی تھی۔ اور میرے ساتھ تو رتھ پہ کرشن بھگوان بھی نہ تھے۔

اس ناز و اندازِ دلبری سے گھائل ہو کر سوچا کہ موبائل پیش کر دوں۔

پھر خیال آیا کہ لمحہ لمحہ مرتی رہے، موبائل لانے والے کے قدموں کی چاپ سنتی رہے، خزلاکی کوتل کی طوفانی ہوائیں کھڑکیاں دروازے بجائیں تو اسے گیٹ کی دستک سنائی دے، کانپ کانپ جائے، ہر اجنبی کال پر تھر تھرا اٹھے، سوتے میں گھبرا کر جاگ اٹھے۔

''وہ موبائل تو پولیس لے گئی تھی۔''

میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

اس کا چہرہ سنگینیوں میں گھرا گوادر بن گیا، آواران کی خشک ندیوں سا اجاڑ، ہراساں۔

میں اسے دیکھے بغیر ہی دبے پاؤں باہر چلا آیا۔

گھر سے بدستور شہنائیوں کی آوازیں ابھر رہی تھی۔

چہار غاشق (چار ذات)	کوئٹہ کا چار دانت نما پہاڑ
گواڑخ	صحرائی گل لالہ
خیسن (سونا)	درہ بولان کا پہاڑ جس میں خزانہ بھرا سونا مدفون ہے
کوہِ مراد	تربت کی مقدس پہاڑی
توتک کی قبر	خضدار کے نواح میں واقع توتک جس کے گڑھے سے سیکڑوں گمشدہ افراد کے اجسام نکلے
گوادر (گوات در)	نسیم بحری کا دروازہ
دروج	تیز رفتاری سے گزرنے والی ہوا، جو سب کچھ لے اڑا لے جائے

چارگل

بہت سال بیتے، بہت سے موسم گزرے، سورج ڈھلے مگر عالم کو کچھ خبر نہ ہوتی۔ نمازِ فجر پہ احساس ہوتا کہ ایک نیا دن، نیا سورج طلوع ہوا ہے۔ پھر وہی روکھا سوکھا ناشتہ اور دن بھر کی مزدوری۔ قیدیوں کو محض اتنا ہی کھانے کو دیا جاتا کہ وہ زندہ رہیں۔ قیدیوں کی زندگی ستاون اسلامی ملکوں کے آزاد شہریوں سے مختلف نہ تھی۔ وہ موت اور زندگی کے درمیان جھولتے رہتے۔ کوئی سانسوں کی زنجیر توڑ ڈالتا تو اسے ویران قبرستان میں دفن کر آتے۔ جو قیدیوں، پردیسیوں کے لیے مخصوص تھا۔

زندگی گزر رہی تھی، بے ٹکٹ مسافر کی طرح کہ جانے کون کب اُچک لے کہ قیدیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سنسنی دوڑ گئی کہ دونوں ملکوں کے بیچ خاردار تار لگا کر سرحد بند کر دی جائے گی، بلکہ کام تو شروع بھی ہو گیا ہے۔ قیدی حیران تھے کہ ان کا ملک اپنے بھوکے ننگے دربدر باراں پتھر بار شہریوں کو صاف پانی تو دے نہیں سکتا، بھوک کے ہاتھوں مائیں اپنے بچے بیچ رہی ہیں، دوائیاں نہیں ہیں، لوگ مر رہے ہیں۔ لوگ مزاروں سے خوردہ اٹھا کر اپنے پیاروں کے لیے لے جاتے ہیں کہ پیر کی طاقت سے محض خوردہ چاٹنے سے مریض تندرست ہو جائے گا۔ اور اربوں روپے سے پشتون کو خطِ استوا کی طرح فرضی لکیر سے کاٹنے کے بعد اب

خاردار تاریں بھی لگا رہا ہے؛ دوسری دیوارِ برلن۔کیا دیوار سے جرمن یا پشتون نیشنل ازم کٹ جاتا؟

یوں تو قید سے فرار ہونا مشکل تھا، چند ایک نے کوشش بھی کی تو پہاڑی دوروں میں بھاگنے والوں کو سنائپر نے بارہ اشاریہ سات کی بندوق سے ڈیڑھ دو کلومیٹر سے اڑا دیا۔ بعض کو زخمی حالت میں چھوڑ دیا تو وہ سینے کے بل رینگتے وطن کی جانب کھسکتے چلے گئے۔اور ایک آدھ گھنٹے میں ہی تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔بعض کی تو ٹانگ توڑ کر ہی لے آئے کہ اپاہج کیا بھاگے گا۔

عالم بھی دیگر قیدیوں کی طرح جہاد کے لیے افغانستان گیا تھا۔ملا ان کی غیرت اور جذبہ ایمانی جگا رہے تھے کہ وہ افغانستان جا کر جہاد کریں۔جہاد افضل ترین عمل ہے؛ غازی یا شہید۔اور مسلمان تو غازی ہی بنتا ہے، نیازی نہیں۔

عالم کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔اس نے بھی فیصلہ کیا کہ یہ مقدس فریضہ انجام دے آئے۔خیر سے حج تو وہ کر چکا تھا، اگر جہاد بھی کر آئے تو جوانی ہے، کچھ اتنی ذمے داری نہیں، باغوں کو والد اور چچا نے سنبھال رکھا ہے۔مال مویشی نوکر چاکر بخوبی پال رہے ہیں۔بہت ہی مستعد اور ایماندار چوپان تھے۔عالم کی بیوی کا نام تو گل غٹی (گلاب کی ٹہنی) تھا مگر وہ پیار سے اسے زڑگیہ (دل رُبا) ہی کہا کرتا۔زڑگیہ نے سخت مخالفت کی تھی کہ ایک مسلمان ملک کے خلاف جہاد کیسے ہوسکتا ہے۔اپنے ہی پٹھان کلمہ گو جوانوں کو جا کر گولیاں مارنا۔وہ کہا کرتی کہ یہ دراصل امریکہ اور روس کی لڑائی ہے، سرمایہ داری اور کمیونزم کی لڑائی ہے۔جس میں پٹھانوں کو بطور ایندھن استعمال کیا جاتا ہے۔جیسے شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد شہید نے دہلویوں کا لشکر تیار کرنے کی بجائے پٹھانوں کے علاقوں میں جا کر جہادی تیار کیے۔مغل بھی کڑے وقت پہ پٹھانوں کو مدد کے لیے بلواتے اور پھر فتح کے بعد طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیا کرتے۔جہاد کے لیے اکسانے والے خود تو ترکی دنبوں کی طرح لم مٹکاتے اچھالتے پھر رہے ہیں، خود کیوں

نہیں جاتے۔ سعودی ریال اور امریکی ڈالر کی گرمی ان کے زورِ خطابت کے لیے مہمیز ہے۔

خالہ اور چچی نے پہلے ہی منع کیا تھا کہ گل غٹی سے وہ شادی نہ کرے۔ پڑھی لکھی لڑکیوں کے دماغ میں عجب خناس بھر جاتا ہے۔ بہکی بہکی باتیں کرتی ہیں۔ گل غٹی تو بالکل حور سی تھی۔ بے حد حسین۔ بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے۔ یوں تو شادی پہ بہت سے زیورات دیے تھے، ولور البتہ اس کے خاندان نے نہ لیا اور سختی سے انکار کیا۔ کنگھڑ (کنگن)، غاڑاگئی (نیکلس) چمبہ (ہاتھ کا زیور)، سنگار پٹی (ماتھے کا جھومر) اور جانے کیا کیا۔ عالم کا تو جی چاہتا کہ اپنا دل نکال کر چارگل (لونگ) میں ہی لگا دے جو سارا دن اس کے ساتھ رہتی؛ دن رات، سوتے جاگتے، نماز پڑھتے، سجدہ کرتے۔ عالم خصوصی طور پر کوئٹہ سے یہ چارگل لایا تھا۔ سنار سے اس نے بڑھیا ترین چارگل طلب کی تھی۔ سنار صاحبِ ذوق تھا۔

"یہ ایک کیرٹ کا ہیرا ہے۔ ہلکا سا زرد ہے ورنہ تو اور بھی مہنگا ہوتا۔ ہم تو پچیس سینٹ سے اوپر کا نہیں لگاتے۔ یہ اتفاقاً ہی دوبئی سے آیا ہے۔ جی گریٹ کا ہیرا ہے۔"

جب عالم نے زڑگیہ کو چارگل پہنائی تو اچانک ہی سورج سوا نیزے پہ آ گیا۔ تین سورج ایک ساتھ نور برسا رہے تھے۔ جن سے عالم ڈگمگا کے رہ گیا۔ فضا میں مشہور گیت کی جھنکار سنائی دی۔

"ستا دا چارگل پڑوکی ژڑہ روشنائی دا"

(تمہارے لونگ کی تراش سے زرد روشنی پھوٹتی پڑ رہی ہے)

"شال وا چواہ گرمئ دا"

(اس پہ آنچ ڈالو، گرمی مارے ڈالتی ہے)

جہاد پہ جاتے ہوئے عالم نے وہ چارگل بہ طور نشانی مانگ لی۔

زڑگیہ نے آنسو بہاتے، سسکیاں لیتے ہوئے چارگل (لونگ) اسے اتار دی۔

"جہاد سے واپسی پہ اپنے ہی ہاتھوں سے پہنانا۔"

وہ صرف اتنا ہی کہہ پائی۔کیوں کہ اس مبارک موقع پر آنسو بدشگونی ہوتے۔

عالم کو اندازہ نہ تھا کہ چارگل اسے شکتی اور توانائی بھی دے گی۔مگر جہاد کے دوران جہاں موقع ملتا وہ جیب سے چارگل نکال کر محویت سے دیکھنے لگتا۔ زڑگیہ کا چہرہ چارگل میں آ جاتا۔ہنستی مسکراتی، کرنیں بکھیرتی، کبھی اداس اشک بہاتی، کبھی جدائی کے دنوں کی نراش سی۔ چارگل کی لو بڑھنے لگتی۔عالم دوبارہ جہاد کے لیے تیار ہو جاتا۔

وہ مارتے کاٹتے بہت دور نکل گئے۔ہر طرف زخمی پھیلے ہوئے تھے۔جنگ کی تباہ کاریاں تھیں۔خطیب بھی ساتھ ساتھ ہی تھے۔کچھ دنوں بعد کوئی نیا ہی خطیب چلا آتا۔خصوصاً سعودی خطیب عربی میں بولتے تو جنت، حور، شہادت، مجاہد کے علاوہ کچھ پلے نہ پڑتا۔بس فرفر عربی بولے چلے جاتے۔لیکن وہ سعودی تھا۔محض ان کی امامت میں ادائیگی نماز کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔

مگر جہاد میں زڑگیہ ساتھ ساتھ جو رہتی۔وہ چارگل نکال کر دیکھتا تو جھپاک سے زڑگیہ باہر نکل آتی۔ہر جانب زرد اجالا پھیل جاتا۔

"تم کتنے کمزور ہو گئے ہو۔کتنے اداس لگتے ہو۔"

عالم بڑبڑا اٹھتا۔"جہاد کے نام پر کلمہ گو پشتونوں کو مارنے سے دل خون ہوتا ہے۔ یتیم بچے، بیوہ عورتیں، بھوک افلاس، جلے ہوئے مکان، مسمار حویلیاں۔اللہ! کیا کروں!"

زڑگیہ اٹھلانے لگتی۔"تو واپس چلے آؤ۔آجاؤ۔"

عالم گھبرا سا جاتا۔"کیسے چلا آؤں؟ لوگ کیا کہیں گے کہ عالم جہاد سے منہ موڑ آیا۔کون جانے گا کہ تمہارے لیے۔سبھی کہیں گے کہ بزدل تھا، بھاگ نکلا۔ہم تو تلواروں کے سائے میں جینے والے موت کے محبوب ہیں۔"

عالم کے بعض ساتھیوں نے اسے محویت سے باتیں کرتے دیکھ بھی لیا تھا۔وہ مسکرا کر نگاہیں پھیر لیتے، کہ چارگل سے بات چیت کر کے عالم جلد ہی ان کے پاس چلا آئے گا، ان

میں شامل ہو جائے گا۔

ایک بڑی لڑائی میں کافروں کا پلہ بھاری پڑنے لگا۔ دونوں جانب سے نعرہ تکبیر کی گھن گرج تھی۔ دونوں جانب گرنے والا با آواز بلند کلمہ طیبہ پڑھتا۔ اور زخموں کی پرواہ کیے بغیر ہی کراہتا، کھسکتا اپنا چہرہ کعبہ رخ کر لیتا۔ جنھیں چھ کلمے آتے وہ مسلسل ورد کرتے ہی چلے جاتے۔ جسم اور روح کا بندھن ٹوٹنے تک ان کی صدائیں بلند ہوتی رہتیں۔ عالم اور اس کے بہت سے ساتھی زخمی ہو کر گرتے رہے۔

جب عالم کو ہوش آیا تو جنت کی حوروں کی بجائے دشمن کی ٹھوکروں میں تھا۔ ان کو ٹھوکریں مار مار کر، منہ پہ پانی ڈال ڈال کر ہوش میں لانے کی تدبیریں کی گئیں۔ ان کے زخم باندھے گئے۔ بعض تو مصر تھے کہ جنگی جرائم میں ملوث ہونے کے باعث موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، جب کہ علما کا دباؤ تھا کہ مسلمان جنگی قیدیوں کو قتل نہیں کرتے، انھیں مارا نہ جائے۔

اگلے چند ہی روز میں قیدی بانٹ دیے گئے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح انھیں ہانک کر لے جایا گیا۔ عالم کے زخم بھی دوا دارو سے بھر گئے تو اسے کام پہ لگا دیا گیا۔ دن بھر قیدی کھیتوں میں کام کرتے، دُنبوں کی پشم اتارتے۔ سردیوں میں لاوندی بناتے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے۔ دنبوں کے بالوں سے نمدے بناتے۔ انھیں خبردار کیا گیا تھا کہ بھاگنے والوں کی سزا موت ہوگی۔ اس کے سامنے ہی چند قیدیوں کو جو فرار ہوئے تھے، موقع پر ہی گولی ماردی گئی۔ بعض ایک کو زخمی حالت میں لائے اور تمام قیدیوں کے سامنے ہی گولی ماردی۔ قیدیوں کو بار بار بتلایا گیا کہ فرار کی سزا موت سے کم نہ ہوگی۔

عالم بہت ہی ناتواں ہو گیا تھا۔ بال بھی سفید ہو گئے تھے۔ ہاتھوں میں وہ طاقت نہ رہی تھی۔ بینائی پہ بھی اثر پڑا تھا۔ لیکن زندگی کی طاقت اسے چارگل سے ہی مل رہی تھی، ملتی رہتی تھی۔ وہ چارگل پہ نظریں جما کر زرگیہ کو طفل تسلیاں دینے لگتا کہ جلد ہی لوٹ آئے گا۔

قیدیوں کو سرحد پہ خاردار تار لگنے کا علم ہوا تو وہ تڑپ ہی اٹھے۔ واپسی کی امید ہی

معدوم ہوگئی۔ امریکہ اور سعودیہ کب کے اپنا مشن پورا کر کے واپس جا چکے تھے۔ ادھر افغان مہاجر ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے۔ کچرہ چننے لگے تھے۔ ساٹھ لاکھ افغان مہاجرین کے لیے بھی واپسی کے راستے مسدود تھے۔ ان کے شناختی کارڈ بھی نہ بن پائے۔ وہ بینکوں میں اکاؤنٹ بھی نہ کھول سکتے۔ نہ انھیں کوئی قانونی تحفظ حاصل تھا۔ ماضی کے قابل احترام افغان مہاجرین کو افغان بھگوڑے کہا جانے لگا۔ لوگ سخت نالاں تھے کہ ہمارے ہاں کیوں چلے آئے ہیں، چلتے بنیں۔ ساٹھ لاکھ مظلوم!! عالم نے ساتھی قیدیوں کو آگاہ کیا کہ خاردار تار لگنے کا عمل جاری ہے۔ جو نکلنا چاہتا ہو ابھی نکل لے۔ بجائے اذیت ناک موت کے، آہستہ آہستہ مرنے کے، وہ فوری طور پر مارے جائیں گے۔ اور یہ امید بھی ہوگی کہ شاید زندہ سلامت گھر پہنچ جائیں۔

اس کے چار قیدی ساتھی بھی بھاگنے کے لیے تیار ہو گئے۔ پہلے تو وہ روٹیاں بچانے لگے۔ چند روٹیاں کم کھاتے اور چھپا لیتے۔ ایک کے پاس کمپاس بھی نکل آیا۔ پلاسٹک کی کچھ بوتلیں بھی ذخیرہ کر لیں۔ عالم نے چارگل میں مقید زڑگیہ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ جس سے وہ بہت ہی خوش ہوئی۔ عالم کی قسمت اچھی تھی کہ تلاشیوں میں بھی چارگل کسی کے ہاتھ نہ لگی تھی۔ ایک تو چھوٹی سی تھی، دو انگلیوں کے درمیان سما جاتی اور زبان کے نیچے رکھنے سے تو بالکل ہی پتہ نہ چلتا۔

''میں بہت جلد آ رہا ہوں زڑگیہ! میرا انتظار کرنا۔''

زڑگیہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ ''ہاں، میں بہت ہی خوش ہوں۔ راہ میں نظریں بچھائیں بیٹھی ہوں۔ بس اڑتے ہوئے چلے آؤ۔'' شیریں دہن، آہو چشم زڑگیہ بے حد خوش دکھائی دے رہی تھی۔

ایک سرد رات میں جب سائبیریا سے آنے والی ہواؤں اور بادلوں کے دَل آبادی پر حملہ آور ہو رہے تھے، انسانوں کو مفلوج بناتے چلے جا رہے تھے، گاجر مولی کی طرح کاٹے چلے جا رہے تھے۔۔۔ وہ پانچوں قیدی دیوار پھلانگ کر فرار ہو لیے۔ کتے ان پر نہ

بھونکے، کیوں کہ وہ برسوں سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ یوں بھی کتوں کی قومیت نہیں ہوتی۔ وہ کسی خاص زمین کو اپنا نہیں کہتے۔ نہ ان کے بادشاہ ہوتے ہیں جو نفرتیں اگائیں۔

رات بھر وہ دیوانہ وار دوڑتے رہے، ڈگ بھرتے رہے۔ کہیں دم لینے کو رکتے، پھر بھاگ نکلتے۔ وہ غیر مانوس اجنبی پگڈنڈیوں سے جا رہے تھے۔ دن کا اجالا ہوا تو وہ ایک کھوہ میں ڈھیر ہو گرے۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے قاتل سنائپر پہاڑی چوٹیوں پہ ٹیلی سکوپ بندوق سے انھیں پہاڑی دروں میں کھوج رہے ہوں گے۔ سرِ شام وہ دوبارہ نکل کھڑے ہوئے۔ سوکھی روٹیاں پانی سے نرم کر کے نگلیں تو جسم میں توانائی کا ایک ولولہ سا آ گیا۔ چار گل میں وہی بجلیاں بھری تھیں۔

"دعا کرنا زڑگیہ، میں ایک دن کا فاصلہ کم کر چکا ہوں، تم سے قریب ہو رہا ہوں۔ میں تمہارے قریب چلا آ رہا ہوں۔" زڑگیہ نے حوصلہ دلایا۔"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہر نماز میں دعا کرتی ہوں۔ دیکھو تم کیسے نکل آئے۔ یہ بھی تو میری دعاؤں کا اثر ہی ہے۔ بس اللہ کا نام لے کر آیتیں پڑھتے چلے آؤ۔" عالم نے حسبِ معمول سوال کیا۔"اور میرے والدین کیسے ہیں؟ ان کی خدمت کر رہی ہو؟" وہ ایک لگاوٹ سے مسکرائی، پھر زڑگیہ اٹھلائی۔"یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ میرے ہی والدین ہیں۔ ان کی فکر نہ کرنا۔" زڑگیہ رخ بدل رہی تھی۔ کبھی مسرور، کبھی اداس، کبھی پژمردہ، پرملال۔ کبھی کھل کھلا کر زندگی بکھیرتی۔ جیسے حسین خاٹول (گل لالہ) جو پہاڑوں کے دامن میں آگ لگا دیتے ہیں، حدت بھر دیتے ہیں، حسن بکھیر دیتے ہیں۔

سبھی دھیرے دھیرے تلاوت کیے جاتے تھے۔ جس کے ترنم سے ایک روحانیت چھائی ہوئی تھی۔ آسمانی طاقتیں روحانی تجلیات انھیں خوف ناک اندھیرے پہاڑوں میں راستہ دکھا رہی تھیں۔ ایک ہی ہفتے میں وہ اپنے وطن کی حدود میں داخل ہو گئے۔ باہم مل کر مبارک بادیں دیں۔ سجدہ شکر ادا کیا۔ اب چھپ چھپا کر چلنے اور سوکھی روٹیاں چبانے کی

ضرورت نہ تھی۔ پہلے ہی پڑاو پہ کوچیوں کے خیموں میں ٹھاٹ سے چلے آئے۔ان کے میزبان کھانا اور شرڑ مبے (لسی) وافر مقدار میں لائے۔میزبانوں کا خیال تھا کہ یہ خڑ ہیں، ملنگ ہیں، اللہ والے درویش ہیں۔ان کی بڑی خدمت کی، جو پشتون ولی (پٹھانوں کا غیر تحریری ضابطہ حیات) کا حصہ ہے۔

وہ خوب پاؤں پھیلا کر سوئے۔جاگے تو عالم کو چارگل سے باتیں کرتے پایا۔ ان کی زندہ دلی لوٹ آئی تھی۔ان کا مشترکہ قہقہہ بلند ہوا۔ایک نے ہانک لگائی؛"ہم جاگ چکے ہیں، شال ڈال دو چارگل پر، ذرا پردہ کرلے۔"

یہاں پہاڑوں کی ترائی تھی، چلنا بہت آسان تھا۔کم خوراکی کے باعث وہ پہلے والی طاقت تو کافور ہو چکی تھی مگر وہ اڑتے ہی چلے جا رہے تھے۔اپنی دھرتی، اپنے وطن میں چلنے پھرنے کا تو مزہ ہی کچھ اور تھا۔آزادی تھی، مکمل تحفظ تھا۔میدانی علاقہ شروع ہوا تو انھوں نے راستے بدلے۔گلے مل کر ایک دوسرے کو کلی (گاؤں) آنے کی تاکید کی۔وعدے لیتے وہ بکھر گئے۔اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔اب وہ مسجدوں میں کھلے عام نماز پڑھ سکتے تھے۔کسی کے حجرے (مہمان خانہ) میں وارد ہو کر کھانا کھا سکتے تھے، آرام کر سکتے تھے۔ایک کلی میں تو اسے نیا لباس بھی پیش کیا گیا۔مگر عالم نے ہی بہتر سمجھا کہ ملنگ کے روپ میں ہی سفر جاری رکھے۔

دُور پہاڑیوں سے اسے اپنا علاقہ دکھائی دیا تو وہ قہقہے لگانے لگا۔ایک چشمے سے وضو بنایا۔نمازِ شکرانہ بھی ادا کی۔اس کا دل چاہتا تھا کہ کوئی تختِ سلیماں جیسی چیز ہو یا جادو کا قالین کہ وہ اڑتا ہوا گھر پہنچ جائے۔اس کے والدین کیسے خوش ہوں گے۔پھر لپٹ لپٹ روئیں گے۔زڑگیہ تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔

عالم کا جسم اس کے ارادوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔وہ گرنے لگا، لہرا کر زمین پر بیٹھ گیا۔اپنی دھرتی، اپنے پتھر، اپنے درخت، ایک نشہ سا طاری ہو گیا۔مگر طاقت جواب دیے

جاتی تھی۔ جسم میں طاقت ہوتی تو دوڑے چلا جاتا۔ اس نے خانہ بدوشوں کے پاس پناہ لی جو گرم سرسبز علاقوں کی جانب صدیوں پرانے راستے پہ دھیرے دھیرے جارہے تھے۔ کچلاک، کوئٹہ۔۔۔ وہ مال مویشی اچھی قیمت پہ فروخت کر کے دوبارہ انھی پہاڑوں کی راہ لیتے جو افغانستان سے متصل تھے۔

اگلی صبح عالم نے انتظار نہ کیا۔ نمازِ فجر کے بعد ہی چل دیا۔ یہ اس کا اپنا علاقہ تھا۔ کلی کے پاس وہی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ویسے ہی بھیڑ بکریاں، مال مویشی ،لہراتی شاخیں، ڈھڈے کھیت!

اسے دوپہر کا کھانا ایک چوپان نے کھلا دیا۔ اب اس کی کلی انتہائی قریب چلی آ رہی تھی، باہیں پھیلائے دوڑی چلی آئی، ہنستی مسکراتی۔

وہ باغ میں داخل ہوا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

مگر باغ میں اسے ایک اجنبی نے روک لیا۔

''ملنگ، آگے پردہ ہے۔ بیٹھو تمہاری خدمت کرتا ہوں، بہت تھکے ہوئے لگتے ہو۔''

چشمِ زدن میں قدرآور کتا لپکا اور عالم کے پاؤں چاٹنے لگا، دُم ہلانے لگا۔ اس نے لپک کر اپنے پنجے عالم کے سینے پر رکھ دیے۔ جیسے گلے ہی لگا لینا چاہتا ہو۔ عالم سے کتے کی محبت دیکھ کر باغ کا مالک پہلے تو حیران ہوا، پھر وہ اسے ملنگ کی روحانی طاقت سمجھا۔ مالک نے اسے ادب و تکریم کے ساتھ درخت کے نیچے لگے گدیلوں پہ بٹھا کر بالشت (گاؤ تکیہ) اس کی کمر سے لگا دیا۔ وہ تو بچھا ہی جاتا تھا۔

''تم کون ہو؟'' عالم نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے یہ چہرہ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

''میرا نام اکرم ہے۔'' اسے جواب ملا۔ اکرم اس سے بے حد احترام سے پیش آرہا تھا۔ وہ خاصا مؤدب تھا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟'' عالم نے سوال کیا۔ اکرم کی موجودگی اسے کھل رہی تھی۔

اکرم جانتا تھا کہ ملنگ درویش ایسے ہی سوال کرتے ہیں جو آسانی سے کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ وہ لپک کر ٹرے میں کھانے کا سامان لے آیا۔

''کھاؤ ملنگ، تم بہت بھوکے اور تھکے ہوئے لگتے ہو۔''

''مگر تم ہو کون؟'' عالم اپنے سوال کا جواب چاہتا تھا۔

''میں اس باغ کا مالک ہوں۔ میرا نام اکرم ہے۔''

عالم کو ویسا ہی جھٹکا لگا جب بندوق کی گولی اس کے بازو سے گزری تھی۔

''مگر یہ باغ، یہ مکان تو عالم خان کے ہیں۔'' عالم کے تیور ہی بدل گئے۔

اکرم نے آہ بھری۔'' آہ! عالم خان جہاد کے لیے گیا تھا۔ رتبہ شہادت پہ فائز ہوا۔ اللہ سبھی کو شہادت کا درجہ عطا فرمائے، آمین۔ بہت سالوں کے بعد بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ اس کی بیوہ کی شادی کر دی جائے۔ عالم کے والدین اس کی راہ دیکھتے چل بسے۔ ایک اکیلی عورت باغوں کو، مویشیوں کو بھلا کیسے سنبھالتی؟ خیر، میں نے یہ کارِ خیر کیا۔ اب ہمارے دو بچے بھی ہیں۔ ہم شہید عالم خان کے لیے خیر خیرات کرتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ شہید زندہ ہوتے ہیں، انھیں تو خوراک ملتی رہتی ہے۔''

اچانک ایٹمی دھماکے ہوئے۔

روسی جہاز بمباری کرتے رہے۔

نیپام بم شعلے برساتے رہے۔

آسمان نے آگ پکڑلی۔

فضا لہولہان ہوگئی۔

سمے سسکیاں لیتا رہا۔

اکرم نہایت ہی عقیدت سے ملنگ کو دیکھتا رہا جو کھانے کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے ہی مراقبے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا تھا۔ اور کتا بدستور ملنگ پہ واری

صدقے ہوا جاتا تھا۔

وقت سائیں سائیں کرتا رہا۔

جیسے سبھی کچھ ساکت ہو چکا ہو۔

ان پہاڑوں کی طرح جو لاکھوں برس سے پتھر بنے بیٹھے ہیں۔۔۔

ہلتے جلتے ہی نہیں۔

عالم جیتے جی شعلوں کی لپیٹ میں جل رہا تھا، بلک رہا تھا۔

صدیوں بعد عالم نے سر اٹھایا۔

باغ اور مکان پہ ایک نظر ڈالی۔

جیب سے چار گل نکالی اور اکرم کو تھما دی۔

"یہ اپنی بیوی کو پہنا دینا۔"

اکرم اس بات پہ کسی مرد کا سر ہی اتار دیتا۔ مگر اس کے سامنے ایک روحانی شخصیت تھی۔ ایک خرڑ، ایک ملنگ۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اکرم اسی بدحواسی میں اٹھ کر گھر چلا آیا۔

اکرم کا ستا ہوا چہرہ، اڑی ہوئی رنگت دیکھ کر زرگیہ پریشان ہوگئی۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟"

مگر اکرم خاموش سا بیٹھا رہا۔ بہت دیر بعد وہ خود میں لوٹ آیا۔

"ایک عجیب سا ملنگ آیا ہے۔ اسے دیکھتے ہی ہمارا کتا اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ پھر اس نے ایک معیوب سی حرکت کی۔ جس کی کوئی مرد ہمت نہیں کر سکتا۔ پہلے تو دل چاہا کہ باغ میں پڑی کلہاڑی سے اس کا سر اتار دوں۔ مگر سوچا کہ اللہ والا ملنگ ہے، جانے کس معرفت کی باتیں کر رہا ہے۔ خود پر قابو پانے کے لیے میں اندر چلا آیا۔ یوں بھی غصہ حرام ہے۔"

زڑگیہ کی پریشانی، مسکراہٹ میں بدل گئی۔"ایسا کیا کہہ دیا بیچارے ملنگ نے۔"

اکرم ہچکچایا۔"یہ چارگل دے کر کہا، اپنی بیوی کو پہنا دو۔ یہ جرأت!"

چارگل دیکھتے ہی زڑگیہ کی چیخ نکل گئی۔ وہ باؤلی ہوگئی۔"عالم زندہ ہے۔ عالم خان!"

وہ دیوانہ وار باغ کی جانب لپکی۔

"عالم خان!" وہ ہذیانی انداز میں پکارے جا رہی تھی۔

باغ خالی تھا۔ کتا غائب تھا۔ وہ عالم کے ساتھ ہی نکل پڑا تھا۔

باغ میں ہر طرف ہواؤں کے جھکڑ تھے۔

دور دور تک جھاڑیاں تھیں اور ہوا کی سرسراہٹ۔

سب کچھ ویران تھا۔ تا حد نظر ویرانیاں تھیں۔

دور دور تک کوئی ذی نفس نہ تھا۔۔۔ سوائے لڑاکا طیاروں کے!!

---

* چارگل پشتو میں بطور مذکر مستعمل ہے۔

حقل دما

بلوچستان کانٹوں کا تاج ہے، چاہ کزحان ہے، بھوک میں ب کا نقطہ ہے۔جانے سمندر سے کیوں ابھر آیا تھا! خشک پہاڑ، بے آب وگیاہ، دشت وجبل۔ پیاسے دریا، جن میں خشک پتھر دھوپ سے چمکتے ہیں۔صحراؤں کی پیاسی بالو سر پٹختی پھرتی ہے۔حضرت ابراہیم نے انسانی قربانی پہ پابندی لگا دی مگر یہاں انسان کی بلی چڑھتی ہے، کتنے ہی گوندکش انسانوں کو چبا جاتے ہیں۔

آگ اگلے سورج کی تمازت سے جھلسے ہوئے کوہسار میں جب اختر آباد کے مقام پر ہریالی ابھری، ایک نرسری نے سر نکالا تو شادابی دیکھ کر دل خوش ہوا۔بریک لگائے اور جیپ موڑی۔

یہ بے نامی بس کی طرح بے نام نرسری تھی۔نہ کوئی بورڈ اور نہ ہی گیٹ، غریبانہ سی تھی۔لیکن تھی بہت سرسبز۔مالی نے کارکردگی دکھاتے ہوئے قبل مسیح کے انداز میں لکڑیاں جوڑ کر ایک بے ڈھنگا سا لکڑیوں کا دروازہ بنا رکھا تھا، جو کسی قدیم مچان سے متشابہ تھا۔

ہارن بجایا تو مالی کا بیٹا دوڑا آیا۔کیوں کہ آر پار بخوبی دکھائی دے رہا تھا، ملیشیا کے گرد آلودہ لباس میں ہاتھ میں رمبی لیے مگر اس کی آنکھیں شمالی تارے کی طرح چمک رہی

تھیں جیسے نئی صبح دیکھ رہا ہو۔ درختوں کے نیچے کھری چارپائی پہ میں تو ڈھیر ہی ہوگیا۔ ایسا سر سبز ٹاپوز مرد سے ڈھلا ہوا، ہمیں کہاں نصیب۔

حال احوال ہوا۔

خیر جان مالی' کرد تھا۔ کرد ترکی سے راس کماری تک کسی زمین کی تلاش میں ہیں جسے اپنا وطن کہہ سکے۔ صدیوں سے ایسی دھرتی کھوج رہے ہیں، جسے وہ اپنا کہہ سکیں۔ مگر خیر جان ان مسائل سے آگاہ نہ تھا۔ اس نے بھیڑ بکریاں فروخت کر کے یہ زمین سالانہ کرائے پہ حاصل کی تھی کہ وہ یہاں ایک نرسری بنائے گا۔ زمین کا مالک بھی کرد ہی تھا اور اس نے وعدہ کیا کہ کرایہ تو بڑھائے گا مگر زمین خالی نہیں کرائے گا۔ ورنہ تو خیر جان کی ساری محنت اکارت جاتی۔ کتنے ہی ٹریکٹر تو اس نے زرخیز مٹی کے ڈلوائے تھے، کچھ فاصلے پہ کسی کا ٹیوب ویل تھا، جو اس کو پانی بھی دیا کرتا۔ ماہانہ رقم لیتا۔

خیر جان کے دو بیٹے تھے؛ ستار اور نور جان۔ وہ باپ کے ساتھ ہی کام کرتے تھے اور خاصے محنتی دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے خشک ٹہنیاں سلگا کر میرے لیے سلیمانی چائے بنائی۔

پہلی ہی ملاقات میں خیر جان سے دوستی ہوئی۔ جسے بھی یوں تو ماما پکارتے مگر تھا میرا ہم عمر۔ لہٰذا میں خیر جان ہی کہتا۔

نرسری اچھی خاصی تھی، گلاب تو قابل تعریف تھے۔

گملے جیپ میں رکھوائے تو مول تول کے بجائے خیر جان مسکرایا اور کہا کہ اتنی رقم ویسے بنتی ہے آپ جو چاہے دے دیں۔ اور پھر گنے بغیر ہی نوٹ رکھ لیے۔

شہر میں تو غیر اعلانیہ جنگ جاری تھی۔ بم دھماکے، اغوا برائے تاوان، ٹارگٹ کلنگز۔ طالبات کی بس پر کسی نے ایسا بم مارا کہ لوہا بھی جلنے لگا سب کچھ خاکستر ہو گیا۔

اس اذیت ناک شہر سے نکلنا بھی سکون بخش تھا۔

بچوں کی شادی ہو چکی تھی ۔نارنگ اور میں اکیلے رہتے تھے ۔ہر طرف خوف اور تنہائی کے گرداب تھے ۔گھر بھر میں تنہائی کے بھوت دانت نکوسے پھرتے ۔جب ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا تو جوان تھے،لیکن کسی بے وفا ہم راہی کی طرح جوانی بھی جُل دے کر غائب ہوگئی تو ہمیں احساس ہونے لگا کہ ہم اکیلے ہیں ۔

مجھے خیر جان سے دلچسپی نہ تھی، میں دراصل اس عقوبت خانے سے نکلنا چاہتا تھا جسے عرفِ عام میں کوئٹہ کہا جاتا ہے ۔اس نرسری میں درختوں کے نیچے وہ ہمارے لیے کسی کا فرنچ میں منجی بچھا دیتے، پھر سلیمانی چائے کا اہتمام کرتے ۔ہم انہیں یہ تاثر نہ دیتے کہ فرار ہو کر کچھ دیر سکون میں رہنا چاہتے ہیں بلکہ یہ بتلاتے کہ پھولوں سے' پودوں سے ہمیں عشق ہے، ہم پودوں میں، ہریالی میں بہت خوش ہوتے ہیں ۔واپسی پر کچھ گملے بھی خرید لیتے ۔گھر میں ان گملوں کے لیے جگہ نہ بچی تو عزیز واقارب، احباب کو گملے تحفہ دینے لگے اور پھر پلاسٹک کی تھیلیوں میں لگے پھولوں پہ اتر آئے ۔کوئی بہانہ تو بنانا ہی ہوتا ۔

ستار کی آنکھوں میں دمکتے سورجوں کا راز بھی جلد ہی کھل گیا، اس کی منگنی ہو چکی تھی، شادی ہونے کو ہی تھی ۔ وہ گھرانا اپنے میں ہی مگن رہتا ہے ۔نرسری سے باہر کیا ہو رہا ہے، انہیں کچھ خبر نہ تھی اور نہ ہی جاننا چاہتے تھے ۔اگرچہ وہ غیر تعلیم یافتہ تھے مگر انہوں نے اپنے کنبے کے گرد ایک ان دیکھی سی لکیر سے گول دائرہ بنا رکھا تھا ۔اس دائرے کے اندر ہی ان کی پوری کائنات تھی ۔باقی انہیں کچھ علم نہ تھا ۔شہر کے مقتل کی انہیں کچھ خبر نہ ہوتی ۔

یوں لگتا کہ یم دیوتا کے پروں کی نوکیلی جنبش سے ایک خوف ناک خاموشی' جان لیوا سکوت طاری ہے ۔کوئی کچھ نہیں بولتا ۔مفلوج ذہن' مردہ ہاتھوں سے سپاہیوں کے احکام بجا لاتے ۔ڈکی' بانٹ اٹھا کر تلاشیاں دیتے ۔لوگ آگے ہی آگے کھسکتے رہتے ۔مجھے اکثر گمان ہوتا کہ ہم سبھی داستان امیر حمزہ یا چار درویش کے روایتی کردار ہیں، جن کی روح نکال کر قلعی کیمپ میں محفوظ کر لی گئی ہو ۔مجھے بچپن میں دیکھی فلم' سات لاکھ' بھی یاد آتی ۔جس کا مشہور مکالمہ

تھا،"سات لاکھ کے بنگلوں میں رہ سکتے ہیں لیکن بیچ نہیں سکتے، سات لاکھ روپیہ گن سکتے ہو خرچ نہیں کر سکتے۔" ہم ایسے بھی انسان تھے؛ کھا پی سکتے ہیں مگر بول نہیں سکتے تھے، سوچ نہیں سکتے تھے۔

اس نرسری میں ہم درختوں، پھولوں، بیلوں کے درمیان خود کو محفوظ سمجھتے۔ وہاں نفرتیں اور خوف نہ ہوتا، سپاہی بھی نہ تھے۔ بس گملے ہی گملے تھے، جن سے زندگی پھوٹتی، ایک مہک سی آتی اور سبزے کی مخصوص باس جو دل کو سکون بخشتی۔ لیکن کسی طور میں خیر جان کو احساس نہ ہونے دیتا کہ ہمارا وہاں آنا سکون کی خاطر ہے۔ اس نرسری پہ نہ تو کوئی میزائل گرتا اور نہ ہی بم پھٹتا۔ شہر سے خاصی دور بھی تھی اور اس میں تو محض پودے ہی تھے، جنہیں کوئی نہیں مارتا، کوئی ان سے خوف نہ کھاتا، تلاشیاں نہ لیتا، باشعور جو نہیں تھے۔

ستار کی شادی کے دن کے قریب آ رہے تھے۔ نرسری ہی کے پہلو میں چھتنار درختوں کی اوٹ میں خیر جان کا کچا مکان تھا، جہاں سے کبھی کبھی شادی بیاہ کے گیتوں کی پُروائی ہوا کے دوش پہ چلی آتی۔

میں ان کا عزیز نہ تھا لہٰذا مجھ سے شادی کے لیے بجار نہ کرتے۔ البتہ میں نے خود ہی کچھ رقم انہیں بجار میں دی۔ نارنگ بھی کبھی کبھار ان کے یہاں چلی جاتی۔ اس نے بھی دلہن کے لیے ایک جوڑا تحفے میں دے دیا۔

ہمیں کسی کام سے کراچی جانا پڑا تھا، سارے اسپتال کراچی میں ہی ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ کراچی کی ضرورت بھی بڑھنے لگتی ہے۔ نارنگ نے واپسی پہ میرے ہمراہ نرسری جاتے ہوئے دلہن سے بھی ملاقات کی، اسے منہ دکھائی بھی دی۔

ستار بہت خوش رہتا، محنت سے کام کرتا ہے۔ اب تو ان کردوں سے قرابت داری سی محسوس ہونے لگی تھی۔

سال بعد ستار کو اللہ نے بیٹا دیا۔ ہم مبارک باد دینے گئے۔ بہت خوشی ہوئی۔ میں

نے اسے تاکید کی کہ بیٹے کو تعلیم دلوانا کیوں کہ تعلیم ملازمت کے لیے نہیں ہوتی بلکہ انسان کا ذہن روشن ہو جاتا ہے۔

شہر کے حالات بدستور خراب ہوتے جا رہے تھے۔ زسری کا بھی کاروبار کچھ سرد پڑ گیا۔ ہم نے بھی سوچا کہ کیا لازم ہے اس آفت زدہ علاقے میں رہنا، بچوں کے پاس چلے جاتے۔ جوتر بیلا، اسلام آباد مردان اور دیگر شہروں میں بہ سبب ملازمت تعینات تھے۔ ان کی ٹرانسفر ہوتی تو ایک نیا شہر ہمارے لیے وا ہو جاتا ہے۔

بہت دنوں بعد ہم زسری گئے تو بچہ کچھ بڑا ہو چکا تھا۔ ہمک کے میری بانہوں میں آ گیا۔ ستار کی زندگی شادی کے بعد بامقصد ہو گئی تھی۔ بہت ہی محنت کرتا تھا۔ اس نے ایک موٹر سائیکل بھی خرید لیا تھا۔

ایک بار میلینیم مارکیٹ میں ان سے ملاقات ہوئی۔ بیوی تو چادری میں سمٹی سمٹائی ہوئی تھی، بچے نے مجھے پہچان لیا۔ میں نے ستار کو کچھ پیسے بھی دیے کہ بیٹے کو کھلونے خرید دینا۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش تھے۔ اس بچے نے تو انہیں اور بھی حسین بنا دیا تھا۔

بچے کا نام فضل تھا۔ بہت ہی پیارا تھا۔ ''غوں غیں'' کر کے مجھ سے گفتگو کی کوشش کرتا، کبھی کلکاریاں مارتا۔ بڑا ہی زندہ دل تھا۔

ستار کے لباس میں بھی سلیقہ آ گیا تھا اور کسی کی نگرانی میں بائی پاس پہ بھی گملے، پودے رکھوانے لگا تھا۔ جس کے باعث لوگ گاڑیاں روک کر پودے خرید لیا کرتے۔ بلوچستان چوں کہ نیم صحرائی خطہ ہے، بلوچستانیوں کی خواہش رہتی ہے کہ کچھ رنگ بکھیر دیں، پودوں سے، پھولوں سے گھروں کو حسین بنا دیں۔

ستار کی محنت سے خاندان میں فارغ البالی آ گئی، ان کے چہرے بھی دمک اٹھے۔

میری مصروفیات بڑھیں تو میں نے اس گوشہ عافیت میں آنا جانا کم کر دیا۔

پھر کئی ماہ بعد گیا تو ماحول بدلا ہوا سا تھا۔ پودے مرجھائے ہوئے تھے، روشیں اجڑ

چکی تھیں بیلوں کا حسن کملا گیا تھا، نرسری ویران پڑی تھی۔

ایک گھنے درخت کے نیچے خیر جان مصلیٰ بچھائے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

قریب گیا تو اس نے خوشی آمدی (استقبال) نہ کی۔ بدستور تسبیح کے دانے پھراتا رہا، ہونٹوں کی جنبش سے البتہ لگتا کچھ پڑھ رہا ہے۔ مجھے شدید دھچکا سا لگا۔ یہ سخت بداخلاقی تھی۔ مجھے ناگوار تو گزرا، مگر میں منجی پر جا بیٹھا۔ یوں لگتا تھا کہ خیر جان کی روح کوئی لے گیا ہے۔ ممی بنا سامنے بیٹھا ہے، حنوط شدہ۔ یا کوئی بغیر بیٹری کا روبوٹ ہے۔

''کیا ہوا خیر جان؟ بولتے کیوں نہیں؟'' میں نے لہجے کی ناگواری چھپاتے ہوئے سوال کیا ہے۔

کمبخت ہے تو مالی، میرے لیے اٹھا بھی نہ، خوش آمدی بھی نہیں کی، ایک بار تو دل چاہا کہ پیر پٹختا پلٹ پڑوں، ایسی ہتک، توبہ!

گہری کاریز سے خیر جان کی کانپتی ہوئی آواز نکلی، جیسے گہرے کنویں سے چھلکتا کانپتا ڈول نکلتا ہے۔

''ستارکو لے گئے، ستار کو اٹھا کر لے گئے۔''

مجھے جھٹکا سا لگا۔ جیسے کسی نے سرد پانی کا ڈول مجھ پہ انڈیل دیا ہو۔

میں بوکھلا کر اٹھا اور خیر جان کے ساتھ آ بیٹھا۔

''کون لے گیا ستار کو؟''

اچانک ہی شام غریباں اتر آئی تھی۔

خیر جان نے طاقت جمع کی۔ ''سرکار لے گئی، پوچھ گچھ کے لیے۔''

میرا من کانپ اٹھا۔

میرے سامنے صحراؤں کی مسخ شدہ لاشیں گزر گئیں۔۔۔اور توتک کا اجتماعی قبرستان

جو ساڑھے تین سو انسانوں کو اپنی کوکھ میں لیے بیٹھے تھا، سبھی کو سمو چا نگل گئی۔۔۔

اور کتنے تو تک ہوں گے؟

ہوائیں سائیں سائیں کرنے لگیں، درخت بین کرنے لگے، پھولوں کی آنکھوں میں آنسو تھے، نمی سسکیاں لینے لگیں۔

خیر جان مجھ سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا کیوں کہ اس کے بیٹے کو اٹھانے والے میرے ہم زبان تھے، وہ مجھے انھی کا حصہ قرار دیتے ہوئے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ شاید چاہتا تھا کہ میں اس کے زخموں پہ نمک نہ چھڑکوں، دلاسے نہ دوں اور چلتا بنوں۔

میں کچھ دیر بت بنا رہا۔ پھر اسے کچھ تسلیاں دیں، کچھ دعائیں اس کی جھولی میں پھینکیں اور بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔

نارنگ کو خبر ہوئی تو بہت ہی پریشان ہوئی۔ ستار کی بازیابی کے لیے دعائیں کرتی رہی۔ ستار کی بیوی اور معصوم بچے کو یاد کر کے روتی رہی۔

اس بچے کو ہی بھی معلوم نہ تھا کہ پوچھ گچھ کیا ہوتی ہے، اس کا باپ اچانک ہی گم کیوں ہو گیا۔ وہ چیخ چیخ کر ماں سے لڑتا کہ اس کے ابا کو لائے، وہ کیوں نہیں آتا؟ رو رو کے ہلکان ہو جاتا اور پھر نقاہت سے سوتا رہتا۔

صرف نرسری نہیں اجڑی، ستار کا پورا گھرانہ ویران ہو گیا۔

چند ماہ بعد اخبار میں خبر آئی کہ ستار کا جسم ملا ہے، روح نہیں تھی۔

سینے میں دو گولیاں لگی تھیں۔

میں جانتا تھا کہ وہ گھرانہ مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے، مگر فاتحہ خوانی تو قرض بھی ہے اور فرض بھی۔ مجھے وہاں جانا ہی تھا۔ میرے عقیدے کے مطابق بھی ضروری تھا کہ اس کے لیے دعا تو کر لوں، مل کر ہاتھ تو اٹھا لوں۔

مجھے لگا مگر مچھ کے آنسو بہانے چلا ہوں۔

وہاں چند ایک ہی لوگ تھے، جن کی گرم نظریں میرے سینے کے پار اتر گئیں۔

خیر جان نے بے دلی سے فاتحہ لی۔میں نے کچھ بولنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ دی۔"اللہ انصاف کرے گا، میں اللہ سے انصاف مانگتا ہوں۔"

وہ مجھے پہچان نہیں رہا تھا۔ایک اجنبی انداز میں جانے خدا سے مخاطب تھا، اسی سے انصاف مانگ رہا تھا۔اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر لگتا تھا کہ جل رہی ہیں۔

نرسری ایک ویران خزاں رسیدہ، قحط دیدہ جھاڑ جھنکاڑ میں منقلب ہو چکی تھی۔گملے سوکھے پڑے تھے، بیلیں خشک تھیں، پودے مرجھائے تھے۔درختوں میں کچھ جان تھی، مگر وہ بھی کملا گئے تھے۔

ہر طرف موت تھی، پژمردگی تھی، خونِ ناحق کے بین تھے۔

کوئٹہ کی پیالہ نما وادی کتنا خون پیے گی؟ یہ پیالہ نما وادی کیا خون سے بھرنا چاہتی ہے؟

سلومی تو کائفا سردار کاہن کے ساتھ چلی آئی۔جنگی دیوتا کے پجاری انسانوں کا خون اسے پیش کر رہے تھے۔

"جب اس کے پکڑوانے والے یہوداہ نے یہ دیکھا کہ وہ مجرم ٹھہرایا گیا تو پچھتایا اور وہ تیس روپے سردار کاہنوں اور بزرگوں کے پاس واپس لا کر کہا، میں نے گناہ کیا کہ بے قصور کو قتل کے لیے پکڑوایا۔انہوں نے کہا، ہمیں کیا، تُو جان۔اور روپیوں کو مقدس آگ میں پھینک کر چلا گیا اور جا کر اپنے آپ کو پھانسی دی۔سردار کاہنوں نے روپے لے کر کہا، ان کو ہیکل کے خزانہ میں ڈالنا روا نہیں، کیوں کہ یہ خون کی قیمت ہے۔پس انہوں نے مشورہ کر کے ان پیسوں سے کمہار کا کھیت پردیسوں کے دفن کرنے کے لیے خریدا۔اس سبب سے وہ کھیت آج تک حقل دما* کہلاتا ہے۔ :پہلے زمانوں کے اسکریوتی بھی خودکشی کر لیتے تھے۔"**

میں نے سب کچھ بھول جانے کی کوشش کی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ زمین مالک کو واپس کر کے خیر جان بھی کہیں چلا گیا۔

میں جس نرسری میں سکونِ قلب کے لیے جایا کرتا، وہ کب کی اجڑ چکی تھی۔ اور خیر جان کی سلگتی تپتی نگاہوں کا سامنا کرنے کی سکت بھی نہ تھی۔

برسوں بعد کرتہ کے علاقے میں ایک مفلوک الحال بوڑھے کو کھجوریں بیچتے دیکھ کر کچھ اپنائیت کا احساس سا ہوا۔ جیسے وہ کبھی پہلے بھی مل چکا ہے۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بیٹھا تھا۔

میں نے بمشکل اسے پہچانا۔۔۔ وہ خیر جان تھا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے لاتعلقی کا اظہار کیا۔

یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ بچہ فضل ہی رہا ہوگا۔

میں نے خیر جان سے دریافت کیا کہ وہ شہر کیوں چھوڑ آیا، فضل لکھ پڑھ کر افسر بن جاتا، اب کیا غربت اور جہالت میں ڈوبا بیٹھا ہے، نہ ہی کوئی امید اور نہ ہی مستقبل۔

خیر جان بہت ہی لاغر ہو چکا تھا بہت ہی خستہ حال تھا۔

بہت ہی کریدنے پہ، اصرار پہ وہ اتنا ہی بولا کہ شہر اس کا بیٹا نگل گیا، وہ اپنا پوتا ترقی یافتہ شہروں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔

اس نے خیری میں کھجوریں لپیٹیں۔ پتونگ کی طرح کندھے پہ رکھیں اور بچے کی انگلی تھام کر بولان کی ویران گھاٹیوں کی جانب چل پڑا۔

پطرس کو یسوع کی بات یاد آئی، جو اس نے کہی تھی کہ مرغ کی بانگ دینے سے پہلے
تو تین بار میرا انکار کرے گا۔

بیابان میں پکارنے والے کی آواز آتی ہے کہ،
"خداوند کی راہ تیار کرو،
اس کے راستے سیدھے بناؤ!"

• حقل دما(AKELDAMA): خون کا کھیت
•• متی کی انجیل۔ 27/8

آغا گل کا فکشن

ناول

1۔دشتِ وفا	300روپے
2۔بیلہ	300روپے
3۔بابو	200روپے
4۔فسانہ جنات	200روپے

افسانے

1۔گورپیچ	300روپے
2۔آکاش ساگر	زیرِطبع
3۔گوانکو	300روپے
4۔راسکوہ	400روپے
5۔پرتھوی غوری	400روپے
6۔پرندہ	300روپے
7۔مشین گردی	300روپے
8۔سونے پہ اگی بھوک	300روپے
9۔آبِ حیات	200روپے
10۔بولان کے آنسو	300روپے
11۔پاپینگان کا مطلب کیا	400روپے
12۔حقل دما	400روپے

ہماری کتابیں یہاں دستیاب ہیں

سیلز اینڈ سروسز
کبیر بلڈنگ، جناح روڈ، کوئٹہ
فون 92-81-2843229
فیکس 92-81-2837672

یونیورسٹی بک پوائنٹ
شاپ نمبر 10، کمپلیکس
بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ
فون 0345-8813838

کلر پکس
09، جناح پلازہ، جناح روڈ، کوئٹہ
فون 0333-7830793

گوہر پی سی او
آٹھ چوک، لیاری، کراچی
فون 0345-6166158

شہید دودا رشید بک شاپ
یونیورسٹی آف تربت، کیچ
فون 0322-26124413

پاک نیوز ایجنسی
مین بازار، تربت
فون 0321-8091190

چاکر کتاب جاہ
گوادر، مکران
فون 0321-8087931

احتشام کمپیوٹر اینڈ گرافکس
پنجگور، مکران
فون 0331-8069700

نگران بک شاپ
پسنی، مکران
فون 0321-5478186

سرمد بک لینڈ
تحصیل روڈ، جھٹ پٹ، جعفر آباد
فون 0345-3900876

بلوچستانی ادیب کبھی حال کی بات نہیں کرتا، بلکہ ماضی کی عظمت کے ترانے گاتا ہے، حال کی ذلت پہ نہیں لکھتا، بے بسی، بے کسی پہ نہیں بلکہ چاکر رند کی بہادری، نودبندغ کی سخاوت، حانی وسمو کے حسن، شاہ مرید و مست کے عشق پہ لکھتا ہے، نصیر خان نوری کے گھوڑے کی دم سے لٹکا سداشیوراو رمرہٹہ سے لڑتا ہے، ادیب و شاعر ماضی کی کلاسیکل عظمت کی بھنگ پلا کر نوجوانوں کو مست رکھتا ہے، اپنا ادبی چنڈو خانہ چلا کر کماتا ہے، آقا اس کی جیب گرم رکھتا ہے۔

ڈپلومیسی کی تعریف ہے کہ خدا کی اس طرح عبادت کرو کہ شیطان بھی ناراض نہ ہو، یہ بھی بلوچوں کے خون میں نوالے ڈبو کر کھاتے، جان بناتے ہیں۔ یہ ادیب و شاعر نہیں، بادشاہ کے درباری Prompters ہیں۔

آغا گل

www.asanbooks.com
ISBN 978-969-694-125-5

کتاب دوستی فاؤنڈیشن
ایوان علم پلازہ 18 اُردو بازار لاہور
Ph: 042-37235427, 051-2607168, 081-2867539